جواب اصول مبادی

ناشر

مجلس التحقیق الاسلامی 99 جے ماڈل ٹاؤن لاہور

نمبر شمار	موضوعات		صفحہ
1	مقدمہ	الشیخ ابوعمر محمد یوسف	3
2	پیش لفظ	الشیخ محمد حسین میمن	10
3	ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم		12
4	غامدی صاحب اور عبادات وآداب		16
5	غامدی صاحب اور اخبار احاد		19
6	غامدی صاحب اور عربی لغت		21
7	زبان کی ابانت میں کلام غامدی اور اس کا تنقیدی جائزہ		29
8	قرآن فہمی اور ندرت اسلوب		33
9	کیا قرآن میزان ہے؟		40
10	حدیث سے قرآن کی تحدید وتخصیص		43
11	مختلف قراءت میں غامدی صاحب کا نظریہ		47
12	حدیثِ ''سبعہ احرف'' پر غامدی صاحب کا اعتراض		55
13	امام ابن شہاب الزہریؒ پر طعن		60
14	غامدی صاحب اور دین فطرت		63
15	غامدی صاحب اور آسمانی صحائف		68
16	غامدی صاحب کے اصول سنّت		73
17	غامدی صاحب کے اصول حدیث		81
18	سنّت اور حدیث میں فرق		94
19	صحیح احادیث اور عقل		97
20	محدثین کے اصول پر ایک نظر		105
21	محدثین کا صالحین سے روایت کرنا		110
22	راوی فقیہ ہونا		118
23	مصادر ومراجع		125

مقدمہ

بسم الله الرحمان الرحيم

الحمد الله رب العالمين والصلوة والسلام على اشرف الانبياء والمرسلين حبيبنا محمد وعلى آله وصحبه اجمعين ۔اما بعد !

قارئین کرام دین اسلام کی حقانیت چودھویں کے چاند کی مانند روشن اور دن کے سورج کی طرح واضح اور چمکدار ہے۔اور جب رسول اللہ (ﷺ) کی خوشبوئیں بکھیرتی سنن کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات دل میں راسخ ہوجاتی ہے کہ واقعی قرآن کریم فرقان حمید کی اصل تفسیر یہی سنن واحادیث ہے اور انہی سنن کے ذریعے اچھائی اور برائی خبیث وطیب کو جانچا جاسکتا ہے۔

آج دور حاضر میں ایک بڑی تعداد ان فرقوں کی ہے جو نا صرف تجدید اسلام کے نام نہاد دعوے دار ہیں بلکہ ائمہ کرام ومحدثین عظام مثلاً (شعبہ مالک شافعی علی بن مدینی یحیی بن معین احمد بن حنبل بخاری اوران کے تلامیذ) کے مرتب کردہ ان اصول وقواعد میں بھی جدت لانا چاہتے ہیں کہ جن کی روشنی میں علمائے سلف وخلف احادیث وسنن کی تحسین وتضعیف فرمایا کرتے تھے اور آج بھی انہی اصولوں کے ذریعے احادیث وآثار کو من حیث القبول ورد جانچا جاتا ہے اوران اصولوں کی تکمیل پر دور سلف سے اب تک مستقل اجماع چلا آرہا ہے آج کل کے نام نہاد مفکرین نے اس اجماع کی مخالفت کر کے اوران اصولوں میں کمی کا دعویٰ کر کے اپنے آپ کو بے وقوفوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ جو ہفوات وہ اپنے منہ سے نکال رہے ہیں خود اس کی بھی صحیح معرفت نہیں رکھتے اور جہاں تک ان اصولوں کا تعلق ہے تو یہ بات مسلم ہے کہ ان اصولوں میں نا کسی قسم کی کمی وبیشی ہوسکتی ہے اور نا کسی قسم کا تغیر وتمدن ہوسکتا ہے کیونکہ یہ اصول دراصل قرآن وسنت سے ماخوذ ہیان کا مرجع ومصدر نصوص شرعیہ پر مبنی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ اصول مستقل اور ہمیشگی

کے لئے ہیں۔قارئین کرام اس بات کو اچھی طریقے سے اپنے اذھان میں جاگزین کرلیں کہ سنت رسول (ﷺ) کے راستے پر چل کر ہی درحقیقت سلامتی اور عزت حاصل کی جاسکتی ہے اور جولوگ سنت محمدیہ کے رستے کو ترک کرکرالحادی یونانی فلسفے اور باطل تاویلات کو قرآن فہمی کے لئے اپناتے ہیں اللہ رب العالمین نے ذلت اور رسوائی ان کا مقدر کردی ہے۔

عصر حاضر میں ان لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک تو وہ لوگ کہ جو دین اسلام کے اصولوں کو منہدم کرکے اصل اسلام کو منہدم کرنے کے درپے ہیں اور دوسرے وہ لوگ جو اپنی سی کوشش کرکے دین اسلام کی پابندیوں سے اپنی جان چھڑانا چاہتے ہیں اور جب کبھی بھی ان مفسدوں کے باطل نظریات کو محسوس کیا گیا تو علمائے وقت نے نا صرف ان کی گردنوں کو موڑ ڈالا بلکہ ان کی جھوٹی زبانوں کو جڑ سے اکھیڑ دیا۔اللہ ان کو ہلاک کرے۔ یہ کس قسم کے باطل نظریات لے آتے ہیں۔آج جب ایک طرف امت اسلامیہ مختلف مصائب اور فتنوں کا شکار ہے تو دوسری طرف الحاد اور ارتداد وزندقہ ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کی صفوں میں پنپنے کی کوشش کررہے ہیں اور اصول شریعت (کہ جس کو امام الانبیاء (ﷺ) آپ کے صحابہ اور خیروالقرون پر مبنی ایک کثیر جماعت نے ترتیب دیا تھا) مسخ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔درحقیقت یہ لوگ مستشرقین کے نظریات سے متاثر ہوکر ان کے پیچھے چل نکلے ہیں ان لوگوں نے اپنی گندی اور ناقص عقل کو سنت رسول (ﷺ) کے جانچنے کا معیار بنا رکھا ہے کہ اگر سنت نبوی (ﷺ) عقل کے موافق ہو تو قبول کرتے ہیں وگرنہ رد کردیتے ہیں سنت نبوی (ﷺ) پر طعن وتشنیع کرکے یہ لوگ اپنی اور اپنے باطل نظریات کی تشفی یہی لوگ دور حاضر کے ملحد اور منافق ہیں کہ جو اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھانا چاہتے ہیں مگر اللہ رب العالمین اپنے نور کو پورا کرے گا اگرچہ کفار کو یہ بات ناگوار کیوں نہ گزرے۔ان ملحدوں کا تو یہ حال ہے کہ یہ نہیں جانتے کہ ایمان باللہ کا تصور ایمان بالرسالۃ اور آپ (ﷺ) کو حاکم مانے بغیر پورا ہو ہی نہیں سکتا اس لئے کہ حاکمیت اور قضاء دو چیزوں پر موقوف ہیں (1) قرآن (2) رسول اللہ (ﷺ)۔ان دونوں میں سے کسی ایک پر بھی عدم ایمان واطمنان کا مظاہرہ منافقین کی صفوں میں لا کھڑا کرتا ہے پس وہ شخص جو رسول اللہ (ﷺ) کی حاکمیت کا معترف نہیں یا اپنے دل میں اس سے متعلق کچھ کجی یا حرج محسوس کرتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے ایمان کی خیر منائے کیونکہ وہ مؤمنین کے ضمرے سے خارج ہوگیا ہے۔کیونکہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو اس پر رسول اللہ (ﷺ) کی اتباع اور پیروی ضروری ہے اور اللہ تعالی کی محبت اتباع رسول کے ساتھ مشروط ہے اور آپ کی عدم اتباع باعث کفر ہے۔

دور حاضر میں اسلام اور شریعت اسلامی کے خلاف دشمنان اسلام کا ایک سلسلہ چلا ہے جو رسول اللہ (ﷺ) کے طریقے پر طعن کناں ہیں انہوں نے اپنے گزشتہ گان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لوگوں کے سامنے ضرورت اکتفاء بالقرآن کا نظریہ پیش کیا ہے ان کا یہ کہنا ہے کہ آپ (ﷺ) نے پیغام الٰہی اور کتاب اللہ کو لوگوں کے سامنے رکھا مگر اس کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ یہ فرقہ تمام اسلامی ادوار میں موجود رہا ہے۔ان کے باوجود زبانی اختلاف کے رسول اکرم (ﷺ) کی سنت کی بابت ناقابل برداشت باتوں کو نقل کرنا اور آپ (ﷺ) کے طریقے پر شکوک وشبھات کا اظہار کرنا اسی طرح امت مسلمہ کے درمیان زہر پاشی کرنا ان کی مشترکہ کاوش رہی ہے۔اسی طرح زبانوں سے وہ بات کہتے جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی۔

انکو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ اسلامی معاشرہ جو کہ خیر وبرکت کا منبع ہے انکو برداشت نہیں کرتا بلکہ انکے اس باطل دعوی کو بادی الرأی قرار دیتا ہے اور بہت ہی جلدی ان کے کفر وزندیقیت کو منظر عام پر لاتا ہے۔

اور وہ اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لئے پس پردہ کام کررہے ہیں اور ان کی یہ ہر ممکن کوشش ہے کہ لوگوں کے دلوں میں شک وشبھات ڈال کر اسلامی اصول ومبادی کو مشکوک قرار دے دیں! جب انہوں نے دیکھا کہ لوگوں کی زندگی کا زیادہ تعلق رسول اللہ (ﷺ) کی احادیث کے ساتھ منسلک ہے تو انہوں نے اس اصول زندگی (حدیث رسول) کو گرانے کے درپے ہوئے

اورانہوں نے اس کی تحریف وتبدیل اورعوض لانے سے گز یر تک نہیں کیا!

اورانہوں نے تقدیس افکاراہل غرب کولوگوں کے سامنے رکھااورعربی کلچراورثقافت کی تعظیم بیان کی ۔اسی طرح انہوں نے غربی طرز زندگی کوایک بہترین ،معقول ،قابل تعریف اور لائق اخذطریقہ قرار دیا۔

عرب ممالک میں اس فکر کے پھلانے اور پاشان کرنے کی ذمہ داری جمال الدین افغانی اوراس کے شاگردخاص محمدعبدہ اورسیدرشیدرضا،احمدامین،توفیق صدقی،محمودشلتوت اورمحمودابوریہ نے لیا۔اورانہوں نے کٹر یچر، مجلّے اورکتابیں جیسے فجرالاسلام،ضحیٰ الاسلام اورالاضواءعلی السنۃ المحمدیہ وغیرہ۔۔۔کے ذریعے سےاپنے مذموم مقاصد کےحصول کے لئے ہرممکن کوشش کی۔

اوردوسرے ذرائع سے بھی انہوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔اس فکر کے علم بردار مصراوراس کے اردگردعرب ممالک میں تاحال موجود ہے۔

البتہ عرب کے علاوہ دوسرے ممالک میں ایک قرن یااس سے کم وبیش پہلے ایک فرقہ پیدا ہوا جس کا یہ نظریہ ہے کہ آپ (ﷺ) کا مقصدصرف لوگوں تک قرآن کریم کوپہنچاناہےاوربس۔

برصغیر پاک وہند میں اس گراں قدرخدمت کی ذمہ داری عبداللہ چکڑالوی ،احمدالدین امرتسری،غلام احمد پرویز اور غلام احمد قادیانی نے لی ہے۔اسی طرح انہوں نے اپنے ضمیروں کو دشمنان اسلام اورمستعمرین غرق کے ہاتھوں بیچ دیا۔اسی اثناء میں اللہ تعالی نے علمائے اسلام جیسے ثناءاللہ امرتسری وغیرہ کی صورت میں میدان میں اتارا ،علمائے حق نے تمام میدانوں میں علم برداران باطل کا مقابلہ کیااوران کے اس خطرناک حملہ کا بھرپور جواب دیا۔

بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ اس طرزفکر کے حاملین کی نشأت آج کل پاکستان خصوصا لاہوراورکراچی میں ہورہی ہےاوروہ سنت رسول سے کلی طورپریاان فرامین جوان کی ناقص عقلوں کے خلاف ہوانکا کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جوہمارے درمیان اسلام کا نام لیتے ہیں مگر یورپ اور انگریزوں کے دسترخوانوں پر پلتے ہیں اوروہ لوگ ہمارے درمیان ایسی چیزین چھوڑرہے ہیں جونہ ہم نے کبھی سنی ہےاورنہ ہمارے پیش رفتگان نے یقیناً یہ فرقہ گمراہ ہےاورہمیں گمراہی کی طرف دھکیل رہاہے۔اسی طرح ہمارے درمیان زہرپاشی کرکےاپنے جراثیم کوکئی طریقوں سے ہم پرمنتقل کررہاہے۔

(1)ان شبہات کواردوزبان میں نقل کرنا جن کومستشرقین نے سنت کے متعلق مروج کیا پھر انہوں نے اس میں (اپنی طرف سے) کچھ بڑھادیااوراس میں کچھ کمی کردی اوراس کے ذریعے امت اسلامیہ کی پسپائی چاہی کہ اللہ کے رسول (ﷺ) نے قرآن کےعلاوہ کسی چیزکو(امت کے درمیان)نہیں چھوڑاکہ جس پراعتمادکیاجاسکے۔

(2)اس جماعت نے اپنی کاوشوں کوسرگرم کیااورروایات اورحکایات کتب اور(ان میں موجود)قصص کی چھان بین کے لئے کھڑی ہوئی تاکہ ان لوگوں کو(ان کتب سے)وہ اشیاءمل جائیں جوان کی سوچ(planning) کےمطابق ہوپھرانہوں نے منگھڑت اورجھوٹی باتوں کوجمع کیاجوان کے گمراہ اورجھٹلانے والےاکابرنےاپنے ذاتی غرض کے لئے اپنی طرف سے ترویج دیا ہے اوراس میں انہوں نے بہت زیادہ علمی خیانت سے کام لیا ہے اور یہ لوگ اپنی اس آواز کو اچھالتے ہیں کہ اے مسلمانوں ! اسلام کوان بے ہودہ باتوں)(یعنی احادیث نبوی) سے بچاؤ نعوذباللہ من ذلک۔افسوس ہےان پراورخرابی ہےان کے لئے۔

(3)عام مسلمانوں کے دلوں میں اس امت کے علماءومفسرین اورمحدثین کے بارے میں شک وشبہات کو پیداکیا کہ یہ(محدثین وغیرھم)اس لائق نہیں کہ قرآن کی فہم کے لئے ان کی طرف رجوع کیا جائے۔

(4)(یہ لوگ)اپنی تحقیقی رغبت اوراپنے مقاصد کے ماتحت قواعداصول کی تاسیس کے لئے

کھڑے ہوئے اس قاعدے پر عمل کرتے ہوئے کہ ''وہ بھی مرد ہیں اور ہم بھی مرد ہیں'' میں کہتا ہوں کہ وہ (حقیقی) مرد تھے اور تم (حقیقی) مرد نہیں ہو اور اگر ہم تمہارا موازنہ ان سے کریں تو تمہاری حیثیت ان کے سامنے ایک کوڑی کی بھی نہیں تو پھر کیسے تمہارے (خودساختہ) اصول ان کے اصولوں کے برابر ہو سکتے ہیں محض ان دونوں اصولوں میں برابری کا دعوی کرنا تمہاری غلط سمجھ اور کم علمی کی دلیل ہے ایسے کس طرح ہاتھ پہنچ سکتا ہے۔

(5) (ان لوگوں نے) قرآنی اصطلاحات میں اس طرح کی تحریفات کیں کہ جس کا قرون ماضی میں (یعنی اسلاف کے زمانے میں) کوئی وجود نہیں ملتا اور اسلامی معاشرے میں یہ مشہور کردیا گیا کہ انہوں نے اپنی کاوشوں کو امت مسلمہ کے لئے جدید اسلام (modern islam) کی ترویج میں صرف کردیا لیکن علمائے اسلام ان کسے ہوئے ہاتھ والے دشمنان کی جماعت کے سامنے خاموش نہ رہے بلکہ وہ ان سے مقابلے اور ان کے باطل نظریات کا رد کرنے کے لئے پیش درپیش رہے ان کی (دین اسلام کے لئے) بڑی کافی وشافی اور مشکورہ خدمات ہیں یقیناً اللہ تعالی نے ان علماء کو توفیق دی کہ وہ اپنے پاس ہر قسم کے وسائل اور ٹی وی پروگرامات اور سرعام مناظرات کے ذریعے اپنے نبی (ﷺ) کی سنت کا دفاع کریں۔ اور ان ایام میں بڑی محنت اور رسائی سے ان دشمنان (حدیث رسول) کے تمام اشکالات اور ہر قسم کے شک وشبھات کا سامنا کرنے کے لئے ادارہ ''تحفظ حدیث فاؤنڈیشن'' کو قائم کیا گیا ہے اور یہ لوگ (یعنی تحفظ حدیث فاؤنڈیشن کی ٹیم) دشمنان اسلام کا مقابلہ کرنے سے کسی بھی میدان میں پیچھے نہ رہے چاہے وہ اجتماعی طور پر ہو یا انفرادی طور پر اور ان لوگوں نے دشمنان اسلام کو ٹی وی پروگرامات اور تحریری مناظرات اور سرعام مجالس میں پاش پاش کردیا اور یہ علمی رسالہ جو تحفظ حدیث فاؤنڈیشن کی ٹیم نے فاضل محمد حسین بھائی کی زیرنگرانی تحریر کیا ہے جن کی اس میدان میں کافی وشافی محنت اور مشکورہ خدمات ہیں کہ وہ اور ان کے ساتھی امت مسلمہ کے اس فرض کفائی کو عصر حاضر میں اور خاص طور پر اس پرفتن دور میں سرانجام دینے کے لئے پیش درپیش ہیں۔ جو شخص ان کے علاوہ اس کام کو سرانجام دے رہا ہے اس کا انکار نہیں لیکن میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی (محمد حسین بھائی کی) خدمات کا اعتراف کروں اور یہ رسالہ جاوید احمد غامدی اور اس کے فریق کے افکار واصول کے رد میں تالیف کیا گیا ہے۔ میری اس بات کی (کہ جو میں نے گزشتہ کہی ہے) واضح دلیل ہے اور یہ ان کی کاوشوں کا ایک نمونہ ہے اور وہ اس تباہ کن سیلاب کا ہر قسم کے وسائل اور مختلف طریقوں سے مقابلہ کررہے ہیں اللہ ان نوجوانوں کو اسلام ومسلمین کی طرف سے جزائے خیر دے اور ان کی کاوشوں کو صحیح معنی میں قبول فرمائے اور ان کے حسنات کو اس دن ان کے میزان میں رکھے کہ جس دن مال واولاد فائدہ مند نہ ہوں گے سوائے اس کے کہ جو اللہ کے سامنے قلب سلیم لے کر آئے میں نے اس میدان میں ان کی جدوجہد خدمات کو دیکھ کر اس بات کو پسند کیا کہ میں اپنی خوش نصیبی سمجھ کر خوش دلی سے ان کی محنتوں کو سامنے رکھ کر کچھ تحریر کروں۔

تو میں نے یہ کلمات قلم بند کئے ہیں اگر یہ حق وصواب ہیں تو اللہ کی طرف سے اور اگر حق وصواب نہیں تو میری کوتاہی اور شیطان کی طرف سے ہے۔

میں اللہ رب العرش الکریم سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کاوش کے سبب میرے اور ان کے میزان حسنات کو بھردے۔ اور میں اللہ سے دعا گو ہوں کہ وہ ہمیں اس دعوت مبارک اور اسلام ومسلمین کی خدمت میں ایک دوسرے کا معاون بنادے یقیناً وہ اس کا اہل ہے اور اس پر قادر ہے اور اللہ کی طرف سے رحمت ہو ہمارے پیارے نبی (ﷺ) اور ان کی آل پر اور رحمت ہو تمام صحابہ کرام پر۔

(آمین)

الشیخ ابوعمر محمد یوسف

(مدیر جامع ابی بکر الاسلامیہ)

پیش لفظ

دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جوانسان کی ہرموڑ پر رہنمائی کرتا ہے تاکہ انسان اپنے انجام خیر کو پہنچ سکے .اس مقصد کی تکمیل کے لئے اللہ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تاکہ انسانیت کو گمراہی سے نکال کر ہدایت کے راستے پر گامزن فرمائیں۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے قول ،فعل ،اور تقریر کے ذریعے (جسے حدیث کہا جاتا ہے) دین اسلام کی وضاحت فرمائی جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس مانزل الیهم (النحل۔۴۴)

ترجمہ:اور ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر اتارا تاکہ آپ اسکی وضاحت کردیں لوگوں پر۔

معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تشریح اور توضیح کا عظیم کام نبی اکرم ﷺ کے ذمہ لگایا گیا یعنی جیسے قرآن کریم مأخذ شریعت ہے اسی طرح ہر صحیح حدیث بھی مأخذ شریعت ہے بغیر کسی اختصار کے. قرآن مجید کے بارے میں ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہے کہ یہ کتاب اللہ ہے اور قطعی ہے آج تک مسلمانوں کا اس بات پر اجماع رہا ہے لیکن احادیث کے بارے میں عام مسلمان کسی ایک نتیجے پر جمع نہیں ہیں وہ اس مسئلہ میں متزلزل ہیں لیکن اس کے برخلاف ہم اپنے اسلاف کو دیکھتے ہیں تو وہ قرآن کریم کی طرح ہر صحیح حدیث بھی قطعی مانتے تھے۔

ابن حزمؒ فرماتے ہیں

والقرآن والخبر الصحیح بعضها مضاف الی بعض وهما شیئ واحد فی انهمامن عنداللہ تعالیٰ وحکمهما حکم واحد فی باب وجوب الطاعة لهما (قواعد المحدثین صفحه ۳۹۰)

ترجمہ:قرآن اور صحیح حدیث ایک ہی ہیں اس چیز میں کہ وہ دونوں اللہ کی طرف سے ہیں

اطاعت کے باب میں ان کا حکم ایک ہے۔

معلوم ہوا کہ قرآن کی طرح ہر صحیح حدیث بھی قطعی ہے۔

اس کتاب میں آپ کو ان اصولی قواعد پر بحث ملے گی جس پر آج مستشرقین حملہ آور ہوئے ہیں اور ثابت کیا جائے گا کہ اصول حدیث (کے ابواب) میں وہی اصول مقبول ہیں جن کی بنیاد محدثینؒ نے رکھی اور اب ان اصولوں میں ترمیم کرنا وقت کا ضیاع ہے کیونکہ اصول حدیث پر وہ کچھ لکھا گیا ہے کہ قیامت تک اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں۔

یہ محض دعوی نہیں بلکہ حقیقت ہے اگر آج بھی کوئی کاوش کرتا ہے تو اسے انہی اصولوں پر ہی سے گزرنا ہوگا اور وہی قواعد سامنے رکھنے ہونگے کیونکہ رجال کا تعلق محدثین کے فرمانے سے تھا اسی وقت اسماء الرجال کی ضرورت پڑی اور انہی ایام میں رجال کی تحقیق کی ضرورت پڑی ان معاملات کو دیکھ کر محدثین نے قوانین بنائے جو ہر دور کے لئے کافی ہونگے۔انشاءاللہ

الشیخ محمد حسین میمن

(پریزیڈینٹ تحفظ حدیث فاؤنڈیشن)

غامدی صاحب کی ایک اصطلاح سنت سے مراد ملت ابراہیمی کا جائزہ

اصول غامدی:

سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔قرآن میں اس کا حکم آپ کے لئے اس طرح بیان ہوا ہے:

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔(سورۃ النحل، آیت ۱۲۳)

ترجمہ: پھر ہم نے تمہیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یکسو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔(اصول ومبادی، ص ۱۰)

جواب:

میں اس اصطلاح سے متعلق دو باتیں ذکر کرنا چاہوں گا۔

(۱) غامدی صاحب نے اپنے اس موقف کو ثابت کرنے کے لئے جو آیت پیش کی ہے اگر ہم اس پر غور کریں تو ہمیں دو باتیں معلوم ہوتی ہیں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

"ثم اوحينا اليك ان اتبع ملة ابراهيم حنيفا"(النحل۔۱۲۳)

ترجمہ: پھر ہم نے وحی کی تمہاری طرف کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو۔

یہاں اللہ رب العزت نبی ﷺ سے مخاطب ہے اور لازمی بات ہے کہ جس چیز کا حکم اللہ نے اپنے نبی کو دیا اس پر آپ ﷺ نے عمل بھی کیا ہوگا۔اور نبی ﷺ کا عمل پوری امت کے لئے اسوہ نمونہ اور حجت ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيراً۔(سورۃ الاحزاب، آیت ۲۱)

ترجمہ:"یقیناً تمھارے لئے اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے اس کے لئے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے، اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔"

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ملت ابراہیمی کی معرفت نبی ﷺ کی سنت سے ہوتی ہے جو کہ ہمارے پاس احادیث کے ذریعے پہنچی چاہے متواتر ہو یا احاد۔(احاد کے بارے میں غامدی صاحب کا جو اصول ہے اس کی بحث آگے آئے گی۔انشاء اللہ)

(۲) مذکورہ آیت میں ملت ابراہیمی سے مراد توحید (عقائد) ہے کیونکہ اگر ہم ملت ابراہیمی کی اتباع سے متعلقہ آیات کا بغور مطالعہ کریں تو ان میں ہمیں توحید کا اثبات اور شرک کی مذمت ملتی ہے مثلاً قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ"(البقرۃ، آیت ۱۳۰)

ترجمہ:"ملت ابراہیم سے بے رغبتی وہی کرے گا جو محض بے وقوف ہو۔"

قارئین کرام! اس آیت کو اور اس کے بعد والی تقریباً تین آیات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ملت ابراہیم سے مراد توحید ربّ العالمین ہے ہم نے اختصار کی خاطر ان آیات کا ذکر نہیں کیا تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۱۳۱ تا ۱۳۶۔

مزید براں امام قرطبیؒ اپنی تفسیر احکام القرآن میں اس آیت:

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ (سورۃ النحل، آیت ۱۲۳)

کی تفسیر میں بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں **"والصحیح الاتباع فی العقائد الشرع دون الفروع لقوله تعالیٰ : لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجاً"** (تفسیر القرطبی، ج ۵، ص ۱۴۵)۔

صحیح بات یہ ہے کہ (ملت ابرہیم) کی اتباع کا حکم توحید میں ہے نہ کہ فروع (عمومی مسائل) میں ہے۔اس بات کی دلیل میں امام قرطبی نے یہ آیت پیش کی ہے ترجمہ "کہ ہم نے تم میں سے ہر کسی ایک لئے دستور اور ایک طریقہ بنایا ہے"۔قارئین کرام گزشتہ شریعتوں میں ہر نبی علیہ السلام کو مختلف فروعی احکامات عطا کئے گئے تھے۔ایک شریعت میں بعض چیزیں حرام تھیں تو دوسری شریعت میں حلال تھیں۔بعض میں کسی مسئلہ میں تشدید تھی تو دوسری میں تخفیف لیکن دین سب کا ایک تھا یعنی توحید پر مبنی تھا اس لحاظ سب انبیاء کی دعوت ایک ہی تھی جو کہ توحید ہے۔اس مضمون کی ایک حدیث صحیح بخاری میں بھی آتی ہے:

"نحن معاشر الانبیاء اخوۃ لعلات دیننا واحد"

ترجمہ: "ہم انبیاء کی جماعت علاتی بھائی ہیں، ہمارا دین ایک ہے۔"

علاتی بھائی وہ ہوتے ہیں کہ جن کی مائیں تو مختلف ہوں مگر باپ ایک ہو۔مطلب یہ کہ ان کا دین ایک ہی تھا مگر شریعتیں مختلف تھیں۔

یہی بات حافظ ابن حجرؒ نے کہی ہے (الواضح فی اصول الفقہ، ص ۱۳۰)۔اور یہی مؤقف امام ابن جریر الطبری کا ہے، امام موصوف فرماتے ہیں:

"واولی القولین فی ذلك عندی بالصواب قول من قال معناه :لكل اهل ملة منكم ايهاالامم جعلناشرعةومنهاجا" (تفسیر طبری، ج ۴، ص ۶۱۰)

ترجمہ: "کہ میرے نزدیک حق اور صواب قول یہی ہے کہ ہر اہل ملت کی شریعت ایک ایک (الگ الگ) ہے۔"

چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) سجدہ تعظیمی گزشتہ شریعتوں میں جائز تھا۔ مگر شریعت محمدیہ ﷺ میں حرام اور باطل ہے۔(سورۃ یوسف، آیت ۱۰۰)۔

(۲) دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا گزشتہ شریعت میں جائز تھا مگر شریعت محمدیہ میں حرام ہے۔(سورۃ نساء، آیت ۳۰)

(۳) قربانی کا گوشت و مال غنیمت گزشتہ امتوں کے لئے حرام تھا مگر امت محمدیہ ﷺ کے لئے اس کو حلال کر دیا گیا۔

قارئین کرام! یہ چند ایک معدودے مثالیں تھیں جو ہم نے آپ کے سامنے بیان کیں، اس جیسی اور بھی کئی مثالیں ہیں کہ جن کو ہم نے طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دیا ہے۔

غامدی صاحب اور عبادت و آداب

اصول غامدی:

غامدی صاحب رقمطراز ہیں کہ ملت ابراہیمی کے ذریعے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ عبادات ہیں:۔

(۱) نماز، (۲) زکوۃ، اور صدقہ فطر (۳) روزہ اعتکاف (۴) حج وعمرہ، (۵) قربانی اور ایام تشریق کی تکبیریں۔

جواب:۔

معلوم نہیں کہ غامدی صاحب نے عبادات کے مفہوم میں صرف ان اشیاء کو ہی دین سمجھا ہے یا بطور چند مثالیں لکھ دی ہیں اگر بطور مثال کے لکھی ہیں تو ہمیں چنداں اعتراض نہیں اور اگر ان کی مراد صرف یہی امور عبادات ہیں تو یہ ان کی غلط فہمی ہے اس لئے کہ عبادت کا مفہوم بڑا وسیع ہے اور حیرت کی بات ہے کہ غامدی صاحب ہر جگہ ملت ابراہیم کی رٹ لگاتے نظر آتے ہیں لیکن موصوف نے ملت ابراہیم کے سب سے اہم رکن اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل توحید کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے اور اسی طرح جہاد وقتال جس کے متعلق قرآن میں تقریباً چار سو سے زائد آیات موجود ہیں غامدی صاحب نے ان کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اسی طرح عبادت کی ایک طویل فہرست ہے کہ جس کو ہم طوالت کے خوف سے یہاں رقم نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے بعد غامدی صاحب نے معاشرت کا باب باندھ کر ذیل میں، نکاح وطلاق اور ان کے متعلقات، زن وشوہر کے تعلق سے اجتناب نقل کی ہیں اسی طرح خورد ونوش کا باب باندھ کر چند چیزے ذکر کی ہیں۔

(۱) سور، خون، مردار، اور خدا کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کئے گئے جانور کی حرمت۔

(۲) اللہ کا نام لے کر جانور کا تذکیہ۔

غامدی صاحب دین اسلام کو جو کہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے چند چیزوں میں محصور کرنا چاہتے ہیں جہاں تک تعلق ہے معاملات کا تو نکاح وطلاق اور حیض نفاس میں زن وشوہر کے تعلقات سے اجتناب کے علاوہ وہ دیگر معاملات ہیں جن میں دین اسلام ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ جیسا کہ حقوق والدین اور خرید وفروخت کے معاملات وغیرہ۔

اور جہاں تک بات رہی ان چار چیزوں کی حرمت کی تو اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں ہیں جو حرام ہیں جن کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود نہیں لیکن صحیح حدیث میں موجود ہے جس کو غامدی صاحب فطرت کا نام دیتے ہیں جس کا ذکر ہم اپنے مضمون غامدی صاحب اور فطرت میں کریں گے۔ انشاء اللہ

اصول غامدی:۔

اس کے بعد غامدی صاحب نے کچھ آداب کا ذکر کیا ہے جن کی تعداد تقریباً ۱۸ ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں (۱) اللہ کا نام لے کر دائیں ہاتھ سے کھانا پینا (۲) ملاقات کے وقت السلام علیکم اور اس کا جواب (۳) چھینک آنے پر الحمد اللہ اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا (۴) نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہنا وغیرہ۔

جواب:۔

حیرت کی بات ہے کہ غامدی صاحب خبر واحد سے جو چیز ثابت ہو جائے اس کو دین تسلیم نہیں کرتے جیسا کہ آگے آرہا ہے لیکن اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے خبر واحد کا سہارا لے رہے ہیں بلکہ اس روایت کو پیش کر رہے ہیں جو تمام طرق سے ضعیف ہے جیسا کہ نومولود کے کان میں

اذان دینا اور اقامت کہنا اس بارے میں جتنی بھی روایات کتب حدیث میں موجود ہیں وہ تمام کی تمام ضعیف ہیں اس بات سے غامدی صاحب کی قلت علمی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

اور دوسری حیرت کی بات یہ ہے کہ غامدی صاحب نے ان ۱۸ چیزوں میں اس بات کا ذکر تو کر دیا جس کے ثبوت میں پیش کردہ تمام روایتیں ضعیف ہیں کیونکہ یہ غامدی صاحب کے موقف کے مطابق ہیں لیکن اس بات کا ذکر نہیں کیا جو صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ کیونکہ یہ ان کے موقف کے خلاف ہے۔ مثلا، داڑھی جس کا ثبوت صحیح احادیث سے ملتا ہے جیسا کہ بخاری میں ہے نبی ﷺ نے فرمایا:

”خالفوا المشركين ،ووفرواللحى ، واحفوا الشوارب “

مشرکین کی مخالفت کرو اور داڑھی کو چھوڑدو اور مونچھوں کو پست کرو۔

(صحیح بخاری مع الفتح جلد۱۰ صفحہ ۴۲۸)

اور صحیح مسلم میں ہے:

عن عائشةؓ قالت قال رسول الله ﷺ عشر من الفطرة قص الشارب واعفاء الحية والسواك واستنشاق الماء وقص الاظفار وغسل البراجم ونتف الابط وحلق العانة وانتقاص الماء“ (صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب خصال الفطرۃ، حدیث ۶۰۴)

ترجمہ: (ام المؤمنین) عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دس چیزیں فطرت میں سے ہیں۔ (۱) مونچھیں پست کرنا (۲) داڑہی کو معاف کرنا (یعنی چھوڑ دینا) (۳) مسواک کرنا (۴) ناک میں پانی چڑھانا (۵) ناخن تراشنا (۶) انگلی کے جوڑ دھونا (۷) بغل کے بال اکھیڑنا (۸) زیرناف بال مونڈھنا (۹) استنجا کرنا۔

داڑہی جیسی عظیم سنت کا ذکر قرآن مجید میں نصاً موجود ہے:

”قَالَ يَا ابْنَ أُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي“

ترجمہ: ”(ہارونؑ نے موسیٰؑ سے کہا) اے میرے بھائی میری داڑہی اور سر کو نہ پکڑو“

(سورۃ طہ، آیت ۹۴)

قارئین کرام! مندرجہ بالا حدیث اور قرآن کی آیت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ داڑہی انبیاء علیہم السلام کی سنت متواترہ ہے۔ مگر غامدی صاحب اس عظیم سنت کو شیرِ مادر سمجھ کر ہضم کر گئے۔

غامدی صاحب اور اخبار احاد

اصول غامدی:۔

غامدی صاحب کا نظریہ اخبار احاد (یعنی احادیث رسول ﷺ) کے متعلق یہ ہے کہ دین صرف ان دو چیزوں (یعنی قرآن وسنت جس کو غامدی صاحب سنت ابراہیمی کی روایت کہتے ہیں) کا نام ہے اور کہتے ہیں کہ جن چیزوں کا ذکر (یعنی عبادات، معاشرت، خوردونوش، رسوم آداب) گذشتہ صفحہ پر کیا ہے سنت یہی ہے۔ اور اسی پر صحابہ اور امت کا اجماع رہا ہے اور اس کے علاوہ کوئی چیز دین نہیں اور احادیث احاد کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ کبھی درجہ یقین تک نہیں پہنچ سکتی اور دین میں اس سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا قرآن وسنت میں محصور اسی دین کی تفہیم وتبیین اور اس پر عمل کے لئے نبی ﷺ کے اسوہ حسنہ کا بیان ہے حدیث کا دائرہ وہی ہے چنانچہ دین کی حیثیت سے اس دائرے سے باہر کی کوئی چیز نہ حدیث ہوسکتی ہے اور نہ محض حدیث کی بنیاد پر اسے قبول کیا جاسکتا ہے (اصول ومبادی میزان ص ۱۱)

جواب:۔

قارئین کرام اگر آپ غامدی صاحب کے اس اصول کا غور سے مطالعہ کریں تو آپ کو خود ہی

غامدی صاحب کے اصول کی حقیقت معلوم ہوجائے گی ایک طرف تو غامدی صاحب ضعیف احادیث کو دین کا حصہ تسلیم کررہے ہیں (جیسا کہ بچے کے کان میں اذان دینا) دوسری طرف وہ احادیث جو اخبار احاد کے نام سے جانی جاتی ہیں چاہے وہ سند کے لحاظ سے صحیح ہوں یا نہ ہوں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور اسے دین ماننے سے انکار کررہے ہیں۔

ایک طرف غامدی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ حدیث قرآن کی تخصیص نہیں کرسکتی دوسری طرف خود قرآن کی اس آیت کی تخصیص کررہے ہیں۔

وما اٰ تٰکم الرسول فخذوہ وما نھا کم عنه فا انتھوا (سورہ حشر آیت ۷)

ترجمہ: اور جو کچھ تمہیں رسول دیں اسے لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز آجاؤ۔

یہ حکم ہر صحیح حدیث سے متعلق عام ہے چاہے وہ خبر متواتر کی صورت میں ہو یا خبر واحد کی صورت میں ہو۔ لیکن غامدی صاحب نے اپنی مرضی اور مطلب کی احادیث اور روایتوں کو دین سمجھ کر اور اسے اپنا کر قرآن کے اس حکم کی تخصیص کردی۔ جب غامدی صاحب کے نزدیک حدیث کو یہ حق نہیں کہ وہ قرآن کی تخصیص کرے تو غامدی صاحب کو خود قرآن کی تخصیص کا حق کس نے دیا۔

اور جہاں تک بات ہے غامدی صاحب کے اس اصول کی کہ اخبار احاد سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی درجہ یقین کو نہیں پہنچ سکتا اور دین میں ان سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ نہیں ہوتا۔ غامدی صاحب کا یہ خودساختہ اصول ہے کیونکہ خبر واحد کے بارے میں ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ یہ علم یقین کا فائدہ دیتی ہیں اور اس پر عمل واجب ہے (الاحکام فی الاصول الاحکام جلد ا صفحہ ۱۳۸) اگر آپ کہیں کہ جمہور محدثین نے اسے ظنی کہا ہے تو محدثین کی یہاں ظن سے مراد یہ ہے کہ جب تک ان کی صحت ثابت نہ ہوجائے تب تک یہ ظنی ہے کیونکہ صحت ثابت ہونے کی جو شروط ہیں یہ ظن کو دور کردیتی ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر صبحی الصالح اپنی کتاب میں ذکر کرتے ہیں "**لامعنی للقول بظنیة الحدیث الاحادی بعد ثبوت صحته لأن ماا شترط فیه لقبول صحته یزیل کل معانی الظن ویستوجب وقوع العلم الیقینی به**" (علوم الحدیث ومصطلحہ للصبحی الصالح ص۱۵۲ بحوالہ الباعث الحثیث ص۳۹) "اخبار احاد کی صحت ثابت ہوجانے کے بعد ان کا ظنی ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ حدیث کی قبولیت اور اس کی صحت کے لئے جو شرائط ہیں وہ ظن کے معنی کو زائل کردیتی ہیں اور علم یقینی کا فائدہ دیتی ہیں۔ اور رہی بات کہ اخبار احاد سے دین میں کسی قسم کے عقیدے یا عمل کا اضافہ نہیں ہوتا تو اس شبہ کا ازالہ حافظ ابن حجرؒ نے فرمادیا ہے، حافظ موصوف رقمطراز ہیں:

"**اتفق العلماء علی وجوب العمل ماصح ولولم یخرجه الشیخان**" (قواعد التحدیث للقاسمی صفحہ 87)

ترجمہ: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر اس حدیث پر عمل واجب ہے جس کی صحت ثابت ہوجائے اگرچہ اس کی تخریج شیخان (بخاری ومسلم) نے نہ کی ہو۔

لہذا غامدی صاحب کا یہ خودساختہ اصول اہل علم کے اتفاق کے نزدیک دوکوڑی کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

غامدی صاحب اور عربی لغت

اصول غامدی:۔

غامدی صاحب نے مبادی تدبر قرآن سے متعلق کچھ اصول ذکر کئے ہیں اور تمہیداً قرآن مجید کی عربی فصاحت وبلاغت اور اس کے معجزاتی کلام ہونے پر مختصر بحث کی ہے جس سے ہم اتفاق کرتے ہیں۔ آگے غامدی صاحب رقمطراز ہیں:۔

قرآن مجید کے بعد یہ زبان احادیث اور آثار صحابہ کے ذخائر میں ملتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ روایت بالمعنی کی وجہ سے ان ذخائر کا بہت تھوڑا حصہ ہی ہے جسے اب زبان کی تحقیق میں سند وصحت

کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے لیکن یہ جتنا کچھ بھی باقی ہے اہل ذوق کے لئے متاع بے بہا ہے۔(اصول ومبادی،ص۱۴)

جواب:۔

بلاشبہ قرآن مجید کے بعد عربی زبان احادیث اور آثار صحابہ کے وسیع ذخائر میں ہی ملتی ہے اور یہ کہنا کہ روایت بالمعنی کی وجہ سے بہت تھوڑا حصہ ہی باقی رہا ہے جسے اب زبان کی تحقیق میں سند وحجت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے انتہائی کم علمی پر مبنی اور احادیث رسول ﷺ میں شک وشبھات پیدا کرنے والا اصول ہے اس میں شک نہیں کہ احادیث اوراقوال صحابہ ؓ میں کچھ مرویات روایت بالمعنی منقول ہوئیں ہیں مگر تمام ذخیرہ حدیث روایت بالمعنی منقول نہیں ہے اس لئے کہ صحابہ کرام نے اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال کو بلفظہ بیان کرنے کے لئے کماحقہ کوشش فرمائی ہے۔جیسا کہ حضرت ابو ہریرؓ کے متعلق ایک واقعہ بڑا مشہور ہے کہ مروان نے ایک مرتبہ ابو ہریرہؓ کو بلوایا اوراپنے کاتب کو چارپائی کے نیچے بٹھا کر ابو ہریرہ ؓ سے سوال کرنے لگا،ابو ہریرہؓ کے جوابات (احادیث) کو وہ کاتب چارپائی کے نیچے بیٹھا لکھتا رہا پھر ابو ہریرہؓ وہاں سے تشریف لے گئے ایک سال گزرنے کے بعد مروان نے ابو ہریرہؓ کو پھر بلوا بھیجا اوراسی کاتب کو پردے کے پیچھے بٹھا دیا اور مروان نے گزشتہ سال پوچھے گئے سوالات کوابو ہریرہؓ سے دوبارہ پوچھنا شروع کردیا تواس کاتب کا بیان ہے کہ ابو ہریرہؓ نے ان جوابات (احادیث) میں نہ زیادتی کی نہ کمی نہ کوئی چیز آگے بیان کی اور نہ کوئی چیز پیچھے بیان کی۔(سیر اعلام النبلاء،ج۳،ص۵۲۲)

اوراسی طرح صحابہ کرام سے تابعین کرام نے روایت بلفظہ ہی نقل کی ہیں۔جیسا کہ امام ابن شہاب الزہریؒ کے متعلق امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں رقمطراز ہیں کہ ”خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے امام زہری سے تقریباً چارسو احادیث املا کروائیں اور پھر ایک مہینے کے بعد دوبارہ امام زہری کو بلوایا اور کہا کہ وہ کتاب جو آپ نے لکھوائی تھی ضائع ہوگئی ہے اسے دوبارہ لکھوادیں امام زہری نے کاتب کو بلوا کر وہ احادیث دوبارہ املا کروادیں۔خلیفہ نے اس کتاب کا تقابل جب سابقہ کتاب سے کیا تو اس میں ایک حرف کی چوک واقع نہیں ہوئی تھی۔(تذکرۃ الحفاظ،ج۱،ص۱۳۷)

اوراگر روایت حدیث میں کوئی لفظی بھول چوک محسوس کی یعنی یہ شبہ ہوا کہ یہ لفظ بیان فرمایا تھا یا یہ لفظ۔تو بجائے کسی ایک لفظ نقل کرنے کے وہ دونوں الفاظ ہی نقل فرمادیئے۔باوجود اس کے کہ وہ دونوں الفاظ ہم معنی مترادف تھے۔مثلا ایک روایت میں راوی کو شبہ ہوا کہ حدیث میں لفظ مومن آیا ہے یا موقن تو راوی حدیث نے شبہ کو بالکل ختم کردینے کے لئے دونوں الفاظ کو نقل کردیا۔حالانکہ دونوں الفاظ معناً مترادف ہیں۔اس قدر احتیاط کے باوجود غامدی صاحب کا یہ کہنا کہ اکثر مرویات بالمعنی منقول ہوئیں ہیں کم علمی اور حدیث رسول سے تعصب نہیں تو اور کیا ہے۔آگے غامدی صاحب رقمطراز ہیں ”اس کے (حدیث رسول ﷺ اور آثار صحابہؓ) بعد اس زبان کا سب سے بڑا ماخذ کلام عرب ہے۔“(اصول ومبادی میزان صفحہ۱۴)

اس بات سے ہم بھی متفق ہیں کہ لغت میں قرآن وصحیح حدیث کے بعد کلام عرب کا نمبر آتا ہے۔غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ لغت وادب کہ ائمہ اس بات پر ہمیشہ متفق رہے ہیں کہ قرآن کے بعد یہی کلام ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور جو صحت نقل اور روایت باللفظ کی بناء پر زبان کی تحقیق میں سند وحجت کی حیثیت رکھتا ہے(اصول ومبادی میزان صفحہ۱۶)

غامدی صاحب کے کلام میں تعارض اور ٹکراؤ

اصول غامدی:۔

قارئین کرام !ایک جگہ غامدی صاحب فرمارہے ہیں کہ قرآن مجید کے بعد یہ زبان حدیث نبوی ﷺ اور آثار صحابہؓ کے ذخائر میں ملتی ہے اور پھر اس کے بعد کلام عرب میں اور دوسری جگہ کلام عرب (اشعار وغیرہ) کے متعلق فرمارہے ہیں کہ قرآن مجید کے بعد یہی کلام ہے جس پر اعتماد

کیا جاسکتا ہے۔(اصول ومبادی،ص ۱۵،۱۶)

جواب:۔

جب غامدی صاحب کا خود کا کلام آپس میں متعارض ہے تو اس پر کیسے اعتبار کیا جاسکتا ہے رہی بات کلام عرب کی کہ اسی پر قرآن کے بعد اعتماد کیا جاسکتا ہے تو یہ غامدی صاحب کی اپنی سوچ ہے جس کو وہ ائمہ لغت وادب کے اتفاق کا نام دے رہے ہیں بلکہ قرآن مجید کے بعد زبان کی تحقیق میں دوسرے درجے پر نبی ﷺ کی سنت ہے اور یہی اہل علم لغت وادب کا قول ہے دیکھئے (المزہر فی علوم اللغۃ للسیوطی جلد ا صفحہ ۸۸)

ڈاکٹر محمد التونجی اپنی کتاب (المعجم المفصل فی تفسیر غریب الحدیث صفحہ ۵) میں فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کی حدیث فصیح ہے اور اللہ کے کلام کے بعد سب سے سچی زبان ہے۔ پھر تیسرے نمبر پر کلام عرب ہے جس سے لغت میں استشہاد کیا جاسکتا ہے۔ آگے غامدی صاحب نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے ''**خزانۃ** الادب'' کے حوالے سے لکھا ہے ''جس کلام سے زبان کے معاملے میں استشہاد کیا جاتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک شعر کی صورت اور دوسرا جو شعر کی صورت میں نہیں ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کو اہل علم نے چار طبقات میں تقسیم کیا ہے پہلا طبقہ اسلام سے پہلے کے شعراء جاہلیت کا ہے جیسے ''امرؤالقیس اور اعشیٰ''۔ دوسرا ''مخضر مین'' جنھوں نے اسلام اور جاہلیت دونوں کا زمانہ پایا ہے۔ جیسے لبید اور حسان۔۔۔۔۔۔۔ ان دونوں طبقات کے بارے اجماع ہے کہ ان کے اشعار سے استشہاد کیا جائے گا۔'' (۳/۱) (اصول ومبادی، ص ۱۷) اس سے صرف یہی بات واضح ہوتی ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ کلام عرب (شعر جاہلیت وغیرہ) سے استشہاد کیا جائے گا نہ کہ اس بات پر اجماع ہے کہ بعد از قرآن یہی کلام پر اعتماد ہے۔ اور پھر غامدی صاحب نے آگے اپنے موقف کی تائید میں تفسیر بیضاوی کے حوالے سے سیدنا عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ''تم لوگ اپنے دیوان کی حفاظت کرتے رہو گمراہی سے بچے رہو گے، لوگوں نے پوچھا ہمارا دیوان کیا ہے اس لئے کہ ان میں تمہاری کتاب کی تفسیر اور تمہارے کلام کے معانی بھی ہیں'' (البیضاوی، ج ا، ص ۴۵۹ بحوالہ اصول ومبادی، ص ۱۷)

اسی طرح المزہر فی علوم اللغۃ کے حوالے سے عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے جس کی تفصیل انشاءاللہ آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔ بیضاویؒ نے اپنی تفسیر میں عمر بن خطابؓ کا قول بغیر سند نقل کیا ہے اسی طرح عبداللہ بن عباسؓ کا قول امام سیوطی نے اپنی کتاب (المزہر فی علوم اللغۃ) میں کتاب الوقف لابی بکر انباری) کے حوالے سے نقل کیا ہے جس کی توثیق وتضعیف کا پتہ نہیں ایک طرف تو غامدی صاحب کہہ رہے ہیں کہ قرآن مجید کے بعد کلام عرب (شعر جاہلیت وغیرہ) ہی ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ صحت نقل (یعنی روایت کا صحیح ہونا) اور روایت باللفظ کی بنا پر اور اس وجہ سے ہر زبان کی تحقیق میں حجت ہے اور دوسری طرف غامدی صاحب وہ اقوال پیش کر رہے ہیں جس کی صحت کا پتہ ہی نہیں (یعنی وہ صحیح ہیں یا نہیں) بلکہ صحت تو دور کی بات ہے سند کا ہی پتہ نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ بھی نہیں پتہ کہ یہ اقوال روایت بالمعنیٰ نقل کئے گئے ہیں یا روایت باللفظ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب لوگوں کی اصلاح کے بجائے لفاظی کر کے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ بات عیاں ہے کہ لغت قرآن کو سمجھنے کے لئے نبی ﷺ کی سنت ہی سب سے بہتر ہے کیونکہ قرآن انہی پر نازل ہوا تھا امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ تفسیر کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے اور اگر قرآن میں اجمال ہے تو اس کی تفسیر نبی ﷺ کی سنت کے ذریعے کی جائے کیونکہ نبی ﷺ کی سنت قرآن کی شرح اور اس کی وضاحت ہے (تفسیر ابن کثیر جلد ا صفحہ ۶)

اس مثال سے بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی

''الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانهم بظلم ''اولٰئك لهم الامن وهم مهتدون'' (سورہ انعام آیت ۸۲)

تو صحابہ کرامؓ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی نفس پر ظلم نہ کرتا ہو تو نبی ﷺ نے فرمایا یہ وہ ظلم نہیں جو تم سمجھ رہے ہو بلکہ اس سے مراد وہ ظلم ہے جس کے نہ کرنے کا حکم لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو دیا تھا۔

(یابنی لا تشرك بالله) (سورہ لقمان آیت ۱۳)

اے میرے بیٹے شرک نہ کرنا کہ یقیناً شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔(بخاری کتاب الایمان جلد ا حدیث ۱۳ صفحہ ۱۰۹)

صحابہ کرام جو کہ فصحاء عرب میں سے تھے لیکن عرب کی فصاحت وبلاغت کے عارفین ہونے کے باوجود قرآن کی اس آیت کو نہ سمجھ سکے۔جب انہوں نے نبی ﷺ کی حدیث کی طرف رجوع کیا تو اس آیت کا مفہوم واضح ہو گیا لہٰذا یہ بات ضوء النھار کی طرح واضح ہے کہ عربی لغت کی فہم کا خاص طور پر قرآنی لغت کی فہم کو کلام عرب (شعر جاہلیت) سے زیادہ نبی ﷺ کی سنت کی ضرورت ہے اور ہمیشہ سلف نے اسی پر اعتماد کیا ہے اور ابھی بھی قرآن کے بعد سب سے زیادہ اسی پر اعتماد کیا جائے گا۔

غامدی صاحب خود کو اپنے تئیں بہت بڑا لغوی اور ادیب گردانتے ہیں اپنی ساٹھ سالہ علمی زندگی کے اندر انہوں نے صرف ایک سو بائیس صفحات عربی میں لکھے ہیں جو کہ مختلف رسائل میں مضامین کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ان مضامین میں استعمال کردہ عربی سے بوسیدگی محسوس ہوتی ہے اس میں زیادہ تر الفاظ متروک الاستعمال ہیں۔ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی فرماتے ہیں کہ غامدی صاحب کے انداز بیان میں وہ عیب ہے جو عربی زبان میں ''عجمہ'' یعنی عجمیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ساتھ ہی ان کی عربی تحریریں پڑھ کر یہ احساس ابھرتا ہے کہ یہ عربی زبان کے اسلوب سے بے خبر ہیں انہوں نے بیسویں صدی کے مشہور ادباء محمود احمد شاکر، طٰہٰ حسین، احمد حسن زیات، احمد تیمور پاشا، علی طنطاوی وغیرہ اور اسی طرح عراق سعودی عرب اور مراکش کے ادیبوں اور مصنفین کی تحریروں کو نہیں پڑھا ہے، ورنہ ان کی عربی کا اسلوب ایسا نہ ہوتا کہ جس سے بوسیدگی کی بو آئے یا پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی طالب علم کے سامنے قدیم عربی کی کتابیں ہیں وہ ان کے جملے تشبیہات واستعارات اپنی تحریر میں منتقل کر رہا ہے۔(دیکھئے ماہنامہ ساحل شمارہ نمبر چار اپریل ۲۰۰۷، صفحہ نمبر ۲۷)۔

غامدی صاحب کی اپنی تحریروں میں فحش غلطیاں:

غامدی صاحب اپنے مضمون شرح شواہد الفراہی صفحہ نمبر ا سطر نمبر ۵ ''**بِــوَادٍ قَــفْــرٍ ذُوعَقِبَاتٍ**'' اس مرکب توصیفی کے اندر غامدی صاحب ایک فحش نحوی غلطی کر گئے ہیں ایک عام عربی دان جانتا ہے کہ یہاں ''**ذو عقبات**'' نہیں بلکہ ''**ذی عقبات**'' ہونا چاہیئے اس لئے کہ موصوف ''**واد**'' مجرور ہے اور ''**ذو عقبات**'' اس کی صفت ہے۔عربی قواعد کے مطابق موصوف صفت میں اعرابی مطابقت ہونی چاہیئے اسی طرح ''**اکثر ما تحجب**'' بھی غیر مانوس لفظ ہیں اصل ''**کثیر اما تحجب**'' ہونا چاہیئے تھا۔کیونکہ اس کے بلمقابل ''**قلیلا ما**'' ہے جس کا استعمال قرآن میں ہوا ہے ''قلیلا ما تذکرون'' (النمل، آیت ٦٢)

قارئین کرام! ایسا ادیب اور لغوی جس کی اپنی تحریرات کے اندر ایسی بنیادی غلطیاں موجود ہیں کہ جس کی توقع عربی ادب کے ایک ابتدائی طالب علم سے بھی نہیں کی جا سکتی وہ کلام عرب سے استشہاد کے دعوے کرے اور صحابہؓ و تابعینؒ کی بیان کردہ فصیح وبلیغ عربی پر طعن وتشنیع کرے تو ایسے نام نہاد ادیب اور لغوی کی لغویات کی حیثیت محض بیت عنکبوت کی سی ہے۔

اگر بالفرض قرآن مجید کی تفہیم کا مدار صرف لغت اور کلام عرب کو بنا دیا جائے تو ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر وتفہیم بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گی اور اس قدر عجیب وغریب تشریحات وتفاسیر معرض وجود میں آجائیں گی کہ جن کے ذریعہ معاشرے میں کفر والحاد کو صحیح معنوں میں پنپنے کا موقع مل جائے گا۔

مثلاً اگر ہم لفظ ''صلوۃ'' کی تشریح وتوضیح صرف قرآن مجید اور لغت سے کریں تو لفظ ''صلوۃ'' کا اصل معنی ومفہوم ہی بدل کر رہ جائے گا۔ اللہ رب العالمین قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے **''اقیموا الصلوۃ واتوالزکاۃ'' (سورۃ بقرۃ)**۔ اگر ہم لفظ **''صلوۃ''** کا معنی قرآن مجید میں تلاش کریں تو قرآن میں ایک جگہ موجود ہے ''واقیموا الوزن'' (سورۃ رحمان) کہ وزن قائم کرو ہوسکتا ہے کہ **''اقیموا الصلوۃ''** کے معنی وزن قائم کرنے کے ہوں۔

اب صلوۃ قائم کرنے کا حکم صرف انسانوں کو ہے یا تمام کائنات کو؟ اگر ہم قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ بھی صلوۃ قائم کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

''أُولَـئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ''

ترجمہ: مومنین پر ان کے رب کی طرف سے صلوات اور رحمت بھیجی جاتی ہے۔ (البقرہ، آیت ۱۵۷)

اب اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی صلوۃ ادا کرتا ہے۔ اور اگر لغت میں جایا جائے تو لغت میں صلوۃ کے معنی ٹھمکے مارنے (ناچنے) کے بھی ہیں۔ اگر اب کوئی غامدی صاحب کی طرح کا منچلا اٹھ کھڑا ہو اور **''اقیمو الصلوۃ''** کی تفسیر ناچ گانا کرے اور دلیل کے طور پر قرآن کی یہ آیت پیش کرے:

''اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ''

ترجمہ: ''جان لو کہ دنیا کی زندگی ہے ہی کھیل تماشا'' (سورۃ الحدید، آیت ۲۰)

تو ہم اس کا کیا جواب دیں گے؟ یقیناً یہی کہیں گے کہ صلوۃ ایک مخصوص اصطلاح ہے کہ جس کی تفسیر وتوضیح صرف حدیث اور سنت سے کی جائے گی کہ قیام، رکوع، سجود اور تشہد پر مبنی ایک عمل کو صلوۃ کہا جاتا ہے۔ اور یہی بات حق اور صواب پر مبنی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کی تفہیم وتوضیح خود قرآن مجید کے بعد احادیث اور سنن سے کی جائے گی۔ اور بطور استدلال واستشہاد کلام عرب سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

زبان کی ابانت میں غامدی صاحب کا کلام اور اسکا تنقیدی جائزہ:۔

اصول غامدی:۔

غامدی صاحب نے عربی لغت سے متعلق جو اپنا نظریہ پیش کیا ہے اس پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ اس کے بعد غامدی صاحب نے زبان کی ابانت کا باب باندھا ہے۔ جس میں وہ عربی زبان سے متعلق رقمطراز ہیں: زبان کے لحاظ سے اس کی کوئی چیز اپنے اندر کسی نوعیت کی غرابت نہیں رکھتی ۔ (اصول ومبادی میزان ص ۱۸)

جواب:۔

جب انسان کے اصول ومبادی خود ساختہ ہوتے ہیں تو اس میں مختلف جگہوں پر آپس میں تضاد ہوتا ہے۔ اور اس کی چند مثالیں ہم نے گزشتہ صفحات پر ذکر کی ہیں۔ یہاں پر بھی معاملہ کچھ اسی طرح سے ہے۔ غامدی صاحب یہاں پر لغت قرآن میں غرابت کا انکار کر رہے ہیں۔ (یعنی قرآن میں کوئی چیز غریب نہیں) جبکہ گزشتہ صفحہ پر اپنے مؤقف کی تائید میں انہوں نے عبداللہ بن عباسؓ کا ایک قول پیش کیا ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں:

''اذا سألتم عن شئی من غریب القرآن فلتمسوہ فی الشعر فان الشعر دیوان العرب''۔

تم قرآن میں اپنے لئے کسی اجنبی (غریب) لفظ یا اسلوب کو سمجھنا چاہو تو اس کو جاہلی اشعار میں تلاش کرو اس لئے کہ یہی شاعری درحقیقت اہل عرب کا دیوان ہے۔ (اصول ومبادی میزان ص ۱۷)

یہ وہ ترجمہ ہے جو غامدی صاحب نے اس عربی عبارت کا بیان کیا ہے۔ میں غامدی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ لفظ (اپنے لئے) کس عبارت کا ترجمہ ہے؟ اسی طرح (یہی شاعری درحقیقت

)کس لفظ کا ترجمہ ہے؟ یہاں لفظ (اِنّ) استعمال ہوا جو تاکید کے لئے ہوتا ہے جس کا ترجمہ یقیناً یا بلاشبہ وغیرہ کیا جاتا ہے۔لیکن غامدی صاحب کا لفظ (اِنّ) کا ترجمہ یہی شاعری کرنا بالکل غلط ہے اور خیانت ہے۔کیونکہ لفظ ''یہی'' حصر کیلیے استعمال ہوتا ہے جو عربی زبان میں اِنَّمَا لفظ میں ہوتا ہے۔نہ کہ لفظ اِنَّ میں۔

اس قول کو غامدی صاحب نے اپنی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔اور اس میں لفظ غریب استعمال ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ غامدی صاحب غرابتِ قرآن کو ثابت کررہے ہیں۔جبکہ دوسری طرف اسکا انکار کررہے ہیں جب غامدی صاحب خود ہی اپنے کسی مؤقف پر متفق نہیں تو لوگوں میں کس طرح اتفاق اور اتحاد پیدا کر سکتے ہیں۔جس کی امت کو اس وقت اہم ضرورت ہے۔

اصول غامدی:۔

مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے غامدی صاحب لکھتے ہیں: چناچہ اس کے ترجمہ وتفسیر میں ہر جگہ اس الفاظ کے معروف معنی ہی پیش نظر رہنے چاہئے۔ان سے ہٹ کر اس کی کوئی تاویل قبول نہیں کی جاسکتی۔

(والنجم والشجر یسجدان:الرحمان ۵۵) میں النجم کے معنی ستاروں ہی کے ہوسکتے ہیں ''**الا اذا تمنیٰ**'' (الحج:۲۲۔۵۲) میں الفاظ تمنیٰ کا مفہوم خواہش اور ارمان ہی ہے۔

(اصول ومبادی میزان:۱۸، ۱۹)

جواب:۔

غامدی صاحب عربی زبان جو کہ قرآن وسنّت کی زبان ہے کی فصاحت وبلاغت اور اس کی وسعت کو ختم کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔عربی ایک وسیع زبان ہے جس میں ایک لفظ کے کئی معنی

ہوتے ہیں با قاعدہ اس موضوع پر ادب ولغت کی مشہور کتاب ''**اتفاق المبانی وافتراق المعانی**'' کے نام سے لکھی گئی ہے۔جس کے مصنّف ''ابوربیع سلیمان بن بنین'' ہیں۔جنہوں نے اپنی اس کتاب میں اس موضوع سے متعلق باب باندھا ہے ''**ما اتفق لفظه واختلف معناه**'' کے نام سے یعنی ایک لفظ کے مختلف معانی (دیکھیے مذکورہ کتاب ص ۱۰۵) اس باب میں مصنف نے لفظ (عین) کو مثال کے طور پر پیش کیا عین کے معنی آنکھ کے بھی ہوتے ہیں جیسا کہ اس آیت مبارکہ میں (''**وابیضّت عینٰه**'' سورۃ یوسف ۱۲، آیت ۸۴) اور انکی (یعقوب علیہ السلام کی) آنکھیں سفید ہوگئیں اور عین کے معنی پانی کے چشمے کے بھی ہوتے ہی جیسا کہ اس آیت مبارکہ میں (''**عینا یشرب بھاعباداللہ**'' (الدھر ۷۶، ۵) یہ ایک چشمہ ہے اس سے پیئیں گے اللہ کے بندے۔

لہٰذا غامدی صاحب کا یہ کہنا کہ نجم کے معنی تاروں اور تمنّیٰ کے معنی خواہش کے ہی ہوں گے جہالت پر مبنی ہے ورنہ ہم غامدی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ مذکورہ دونوں آیتوں میں لفظ عین استعمال ہوا ہے کیا غامدی صاحب کا یہاں بھی یہی خیال ہے جو لفظ نجم اور تمنّیٰ کے بارے میں ہے؟

صاحب کشاف زمخشری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ النجم والشجر میں نجم کے معنی بوٹی کے بیان کیے ہیں (دیکھیے تفسیر الکشاف ج ۴، ص ۴۴۲)

یہ ان کی تفسیر ہے جنہیں غامدی صاحب خود لغت کے بہت بڑے امام مانتے ہیں۔اور یہ تفسیر اکثر مفسّرین کی ہے جیسا کہ قرطبی، ابن کثیر، بغوی وغیرہ۔

اسی طرح لغت کی مشہور کتاب (لسان العرب) میں ابن منظور نے جو کہ لغت کے بہت بڑے عالم ہیں اور اسی کتاب کے مصنف ہیں یہاں النجم کے معنی یہی بیان کرتے ہیں (دیکھیے لسان العرب ج ۱۴، ص ۱۵۹)

اور سورۃ الحج کہ آیت نمبر ۵۲ لفظ ''تمنّیٰ'' تلاوت کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے نہ کہ خواہش

یا ارمان کے۔جیسا کہ امام لغت زمخشری اپنی تفسیر کشّاف میں ذکر کرتے ہیں (قیل تمنّیٰ ،قرأ) یعنی تمنّیٰ کے معنی قرأت کرنے اور تلاوت کرنے کے ہیں اور شاھد کے طور پر یہ شعر بھی پیش کیا:

”تمنّیٰ کتاب اللہ اوّل لیلة“

”تمنّیٰ داؤدالزبور علی رسل“

(تفسیر الکشاف ج ۳ ص ۱۶۷)

اور ٹھیک اسی طرح لسان العرب میں مذکور ہے کہ

”تمنّیٰ الکتاب قرأہ وکتبہ وفی التنزیل ”الا اذا تمنیٰ القی الشیطان فی امنیتہ “ای قرأ وتلا ....وقال فی مرثیة عثمانؓ ”تمنّیٰ کتاب اللہ اول لیلة“

”وآخرہ لاقی حمام المقادر“

(دیکھئے لسان العرب جلد ۱۳ صفحہ ۲۰۳ تا ۲۰۴ اور النھایہ فی غریب الحدیث جلد ۴ صفحہ ۳۱۲)

لیکن حیرت ہے غامدی صاحب پر کہ اشعار وکلام عرب کو زبان کی تحقیق میں سند وحجت اور قرآن کے بعد سب سے زیادہ معتمد مانتے ہیں اور پھر اسی کی خلاف ورزی کررہے ہیں۔

لفظ تمنّیٰ کے معنی ہم نے اشعار وکلام عرب سے واضح کردیئے ہیں کہ غامدی صاحب جس کا انکار کررہے ہیں اس سے ان کے خود ساختہ اصول کا رد ہورہا ہے۔کسی نے صحیح کہا تھا ”کہ گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے یا یوں کہہ لیں کہ اسی کی لاٹھی اسی کے سر“

غامدی صاحب نے آگے دو تین لفظوں کی مزید مثال پیش کی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں جو گفتگو ہم نے ان دو لفظوں (تمنّیٰ النجم) پر کی ہے کافی وشافی ہے جس سے حقیقت بالکل واضح ہوگئی ہے اور غامدی صاحب کی خیانتوں کا انکشاف بھی ہوگیا ہے۔

قرآن فہمی اور اسلوب ندرت

اصول غامدی:۔

غامدی صاحب اپنے اصول ومبادی کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(قرآن) اپنے طالب علموں سے جن باتوں کا تقاضہ کرتا ہے وہ یہ ہیں اوّل یہ کہ اس کو سمجھنے کے لئے اس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یعنی وہ پس منظر وہ تقاضے اور وہ صورت حال معین کی جائے جس کو پیش نظر رکھ کر قرآن کی کوئی صورت نازل ہوئی ہے اس کے لئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔یہ سب چیزیں خود قرآن ہی کی روشنی میں واضح ہوجاتی ہیں آدمی جب قرآن پر تدبر کرتا ہے اس کے لفظ لفظ پر ڈیرا ڈالتا ہے لفظوں کے زیر وبم اور جملوں کے در وبست کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو پورے سورہ کے مواقع کلام اس کی خوبی کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں اور اپنے وجود پر اس طرح آپ ہی دلیل بن جاتے ہیں کہ ان کے لئے پھر کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔(اصول ومبادی میزان صفحہ ۲۰۔۲۱)

جواب:۔

ان تحریر شدہ عبارتوں کا جواب کئی صورتوں میں دیا جاسکتا ہے سب سے پہلی بات غامدی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن سے باہر کسی چیز کی ضرورت نہیں اس کی کیا دلیل ہے۔دوسری بات کہ جب قرآن کے ماحول وپس منظر اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کے لئے قرآن کے علاوہ یا قرآن سے باہر کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہی بات تھی تو غامدی صاحب نے قرآن کی صحیح فہم کے لئے اپنے اکابر احسن اصلاحی کی کتاب ”تدبر قرآن“ اور حمید الدین فراہی کی کتاب ”اسالیب القرآن“ وغیرہ کی طرف ترغیب کیوں دلائی ؟(اصول میزان صفحہ ۱۹)

مزید غامدی صاحب کو تفسیر البیان لکھنے کی کیا ضرورت پیش آئی کہ جب قرآن پر غور وفکر کرنے والے کے سامنے بات خود ہی واضح ہو جاتی ہے اس بات کا جواب غامدی صاحب سے مطلوب ہے یہاں سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب قرآن فہمی کے لئے قرآن سے باہر کی چیز کا سہارا لیتے ہیں لیکن جس کو وہ قرآن سے باہر کا نام دے کر غیر ضروری کہہ رہے ہیں اس سے ان کی مراد حدیث رسول ﷺ ہے افسوس کی بات ہے کہ قرآن سے باہر اپنے اکابر کی آراء واقوال کو قرآن سمجھنے کے لئے مان رہے ہیں لیکن حدیث رسول ﷺ کو قرآن کی شرح ماننے سے انکار کر رہے ہیں آخر حدیث رسول ﷺ سے اتنی دشمنی کیوں؟

غامدی صاحب خود قرآن ہی کی روشنی میں کسی سورت کی صورت حال یا اس کا پس منظر معلوم ہونا تو دور کی بات ہے بلکہ یہ بھی واضح نہیں ہوتی کہ یہ سورت کس جگہ پر نازل ہوئی مکہ میں یا مدینہ میں۔مثلاً سورۃ الفیل قرآن مجید ایک چھوٹی سی سورت ہے اللہ رب العالمین نے اس سورت میں ایک مخصوص واقعے کا ذکر کیا ہے اور اس واقعہ کے اندر بے پناہ اجمال ہے پورا قرآن مجید پڑھ جائیں کہیں پر بھی اصحاب الفیل کے اس واقعہ کی تفصیل تو درکنار دوسرا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ اصحاب الفیل کون تھے انہوں نے کیا مکر کیا اور کس وجہ سے ہلاک ہوئے؟ ہماری اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے غامدی صاحب کی اس عبارت کو بغور پڑہیں (قرآن اپنے طالب علموں سے جن باتوں کا تقاضا کرتا ہے وہ یہ ہیں کہ اوّل یہ کہ اس کو سمجھنے کے لئے اس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یعنی وہ پس منظر وہ تقاضے اور وہ صورت حال معین کی جائے جس کو پیش نظر رکھ کر قرآن کی کوئی سورت نازل ہوئی ہو اس کے لئے قرآن کے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی یہ سب چیزیں خود قرآن ہی کی روشنی میں واضح ہو جاتی ہیں: اصول ومبادی، ص۲۰۔۲۱)

قارئین کرام! قرآن مجید ان سوالات واشکالات کی وضاحت وتفصیل خود نہیں کرتا بلکہ یہ ذمہ داری اللہ کے نبی ﷺ کو سونپی گئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ “

ترجمہ: اور ہم نے تمہاری طرف اس ذکر کو نازل کیا تا کہ تم اس کی وضاحت کر دو جو ان کی طرف اتارا گیا ہے“ (سورۃ النحل، آیت ۴۴)

مثلاً قرآن میں ایک آیت مذکور ہے:

”وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ“

ترجمہ: ”اور ہم نہیں اترتے مگر تمہارے ربّ کے حکم سے“ (سورۃ مریم، آیت ۶۴)

اگر ہم اس سے قبل آیت کا مطالعہ کریں اور پھر اس آیت پر غور کریں تو یہ آیت بغیر حدیث کے سمجھنا ناممکن ہے اس لئے کہ اس آیت میں اور اس سے قبل آیت میں جمع متکلّم کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔مثلاً اس آیت سے قبل اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَن كَانَ تَقِيّاً“

ترجمہ: یہ وہ جنّت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بناتے ہیں جو متقین ہیں“ (سورۃ مریم، آیت ۶۳)

اور اس کے فوراً بعد یہ آیت بھی موجود ہے:

”وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ“

ترجمہ: ”اور ہم نہیں اترتے مگر تمہارے ربّ کے حکم سے“ (سورۃ مریم، آیت ۶۴)

اب اگر بغیر حدیث کے قرآن مجید کی روشنی میں اس کو حل کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ **”نعوذ باللہ“** اللہ کا بھی کوئی ربّ ہے اور وہ اس کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہوتا۔جبکہ صرف حدیث ہی اس اشکال کو واضح کرتی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

”عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ لجبریل مایمنعك ان تزورنا اکثر مما تزورنا فنزلت:”وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ“ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ مریم، حدیث ۴۷۳۱)

”ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جبریل سے فرمایا کہ ہماری کثرت زیارت

سے تمہیں کس چیز نے روکا ہے؟ تب یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم نہیں اترتے مگر تمہارے ربّ کے حکم سے۔''

لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ قرآن میں موجود اجمال واشکالات کی وضاحت کے لئے ہمیں قرآن سے باہر یعنی حدیث رسول ﷺ کی طرف لازماً رجوع کرنا پڑے گا۔

اصول غامدی:۔

آگے غامدی صاحب عام وخاص کا ذکر کرتے ہوئے اپنا نظریہ کچھ اس طرح بیان کر رہے ہیں:

سوم یہ کہ اس کے عام وخاص میں امتیاز کیا جائے۔قرآن میں یہ اسلوب جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے کہ بظاہر عام ہیں لیکن سیاق وسباق کی دلالت پوری قطعیت کے ساتھ واضح کر دیتی ہے کہ اس سے مراد عام نہیں ہے۔قرآن (الناس) کہتا ہے۔لیکن ساری دنیا کا ذکر کا تو بارہا اس سے عرب کے سب لوگ بھی اس کے پیش نظر نہیں ہوتے۔وہ (علی الدین کلہ) کی تعبیر اختیار کرتا ہے لیکن اس سے دنیا کے سب ادیان مراد نہیں لیتا۔وہ (المشرکون) کے الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن انہیں سب شرک کرنے والوں کے معنی میں استعمال نہیں کرتا۔وہ (وان من اہل الکتاب) کے الفاظ لاتا ہے لیکن اس سے مراد پورے عالم کے اہل کتاب نہیں ہوتے۔وہ (الانسان) کے لفظ سے اپنا مدعا بیان کرتا ہے لیکن اس سے ساری اولاد آدم کا ذکر مقصود نہیں ہوتا۔
یہ قرآن کا عام اسلوب ہے جس کی رعایت اگر ملحوظ نہ رہے تو قرآن کی شرح ووضاحت میں متکلم کا منشاء بالکل باطل ہو کر رہ جاتا ہے اور کہیں سے کہیں بات پہنچ جاتی ہے۔لہٰذا ناگزیر ہے کہ اس معاملے میں قرآن کے عرف اور اس کے سیاق وسباق کی حکومت اس کے الفاظ ہر حال میں قائم رکھی جائے۔(اصول ومبادی میزان،ص،۲۳)

جواب:۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن میں کوئی عام لفظ مذکور ہوتا ہے لیکن اس سے مراد کوئی خاص گروہ یا چند افراد ہوتے ہیں جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے (الاتقان فی علوم القرآن، ج،۲، ص،۳۱،۳۲) میں ذکر کیا ہے اور مثال کے طور پر اس آیت کو پیش کیا ہے (**الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا۔۔۔۔لکم**)(سورۃ آل عمران،آیت۱۷۳)

یہ مؤمنوں کو لوگوں نے کہا کہ بلاشبہ: لوگوں نے تمھارے مقابلہ کے لئے ایک بڑا لشکر تیار کیا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں (الناس) عام لفظ استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد بعض افراد ہیں کہنے والے بھی اور جمع ہونے والے بھی لیکن اس بات کی معرفت کے لئے ہمیں قرآن کے باہر کی چیز کا سہارا لینا پڑے گا بلکہ ہر شخص کو جو اس کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے قرآن کے علاوہ اس سے باہر کسی اور چیز کا سہارا لینا پڑیگا۔کیونکہ قرآن مجید خود اس بات کی وضاحت نہیں کرتا: جس شخص کو رسول ﷺ سے محبت ہوگی وہ آپ کی حدیث سے اس معرفت کو حاصل کرے گا۔اور اس کی شرح کو مانے گا جس کو اللہ نے شارح بنا کر بھیجا اور اس شرح کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اٹھائی ہے۔اور اس کے برعکس جس کو اپنے اکابر واساتذہ سے محبت ہوگی وہ ان کے اقوال وآراء کی طرف رجوع کرے گا۔جن کی بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ بات صحیح ہے یا غلط ہے؟

قارئین کرام آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ ان دونوں میں سے بہتر کون ہے؟ کیا وہ بہتر ہے جن کو اپنے اکابر اور ان کے کلام سے محبت ہے؟ یا وہ جس کو اللہ کے رسول ﷺ سے محبت ہے اور ان کے کلام سے محبت کرتا ہے؟

غامدی صاحب نے اس اصول کو بیان کرتے ہوئے ان آیتوں کو ذکر کیا ہے جو ان کے

نظریے کے خلاف ہیں۔

جیسا کہ یہ آیت **(علی الدین کله)** غامدی صاحب کا نظریہ ہے اس آیت میں تمام ادیان مراد نہیں ہیں۔یعنی کہ اسلام تمام ادیان پر غالب ہونے کے لئے نہیں آیا۔جو کہ سراسر باطل نظریہ ہے۔کیونکہ دین اسلام تمام ادیان پر غالب ہونے کے لئے آیا ہے۔اس بات کی مزید وضاحت اس آیت مبارکہ سے ہوجاتی ہے **''ان الدین عندالله الاسلام''** (آل عمران، آیت ۱۹)

ترجمہ: یقیناً اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے۔

لہٰذا جب دین اسلام ہی صرف اللہ کے نزدیک دین حق ہے اور اس کے علاوہ کوئی دین حق نہیں تو اس کے علاوہ تمام ادیان باطل ہیں اور مغلوب ہیں اور اسلام ان سب پر غالب ہے۔یہی تفسیر مفسیرین نے اس آیت میں بیان کی ہے۔ دیکھئے (الکشاف، ج،۲ ۔زمحشری، ج،۲، ص،۲۵۳ ۔ اور تفسیر الطبری ، ج،٦، ص،١٣٥٦۔اور تفسیر القرطبی، ج،۴، ص،۴۵اور تفسیر ابن کثیر، ج،۳، ص،۲۰) اور امام ابن کثیر نے اس بات کی تائید کئی احادیث سے کی ہے جن میں ایک یہ ہے:

''عن تمیم الداری رضی الله تعالیٰ عنه قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول لیبلغن هزا الامرمابلغ اللیل و النهار ولا یترك الله بیت مدرولا وبر۔۔۔الخ''(مسند احمد ،ج،۱۳ ،ص،۲۱۱۔حدیث۔١٦٨٩٤)

''تمیم داری فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ یہ دین تمام اس جگہ پر پہنچے گا جہاں پر دن رات پہنچتے ہیں کوئی پکہ یا کچا گھر ایسا نہیں رہے گا جہاں اللہ تعالیٰ دین اسلام کو نہ پہنچائیں۔۔۔الخ۔''

لہٰذا اگر قرآن میں کوئی عام لفظ وارد ہوتا ہے لیکن اس سے مراد کوئی خاص چیز ہوتی ہے تو اس کی معرفت کسی دوسرے قرائن اور دلائل سے ہوتی ہے۔اور اس آیت **''علی الدین کله''** میں عام لفظ ذکر ہوا ہے اور اس کی خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں ۔ بلکہ اس کے عام ہونے پر کافی دلائل موجود ہیں۔

اور اسی طرح غامدی صاحب کہتے ہیں کہ **''وان من اهل الکتاب''** (النساء، آیت ۱۵۹،۴) میں پورے عالم کے اہل کتاب مراد نہیں ہے۔

غامدی صاحب کا یہ اصول کہ عام لفظ خصوصیت پر بھی دلالت کرتا ہے کسی حد تک صحیح ہے جیسا کہ واضح کیا جاچکا ہے مگر جو انہوں نے مثال پیش کی ہے کہ:

''وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ''

اس میں پورے عالم کے اہل کتاب مراد نہیں ہیں یہ مثال سراسر اس اصول کے خلاف ہے کیونکہ کسی بھی عام لفظ کو خاص کرنے کے لئے قرائن وشواہد اور دلائل کو دیکھا جاتا ہے مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللّهُ مِن فَضْلِهِ''

ترجمہ: کیا یہ (یہود) لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس چیز پر جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کی ہے۔'' (سورۃ النساء، آیت ۵۴)

اب لفظ ''الناس'' عام ہے لیکن اس سے مراد خاص محمد ﷺ ہیں جیسا کہ امام ابن جریر اطبریؒ ابن عباسؓ کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں:

''عن ابن عباسؓ: ''أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللّهُ مِن فَضْلِهِ''یعنی محمدا ﷺ'' (التفسری الطبری، ج۴، ص۱۴۱)

جب کہ غامدی صاحب کی پیش کردہ آیت: **''وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ''** میں اہل

کتاب سے مراد تمام عالم کے اہل کتاب ہی ہیں۔جیسا کہ امام ابن جریر الطبریؒ نے ابن عباسؓ، مجاہدؒ،حسن بصری اور عکرمہ وغیرہم کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ ہر اہل کتاب عیسیٰؑ پر ان کی موت سے پہلے ایمان لائے گا۔(تفسیر الطبری،ج۴،ص۳۵۸،۳۵۹)

تو اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں اہل کتاب سے مراد جمیع اہل کتاب ہیں نہ کہ بعض اہل کتاب ہیں۔

قارئین کرام!دراصل یہ آیت قیامت سے پہلے نزول عیسیٰ پر واضح دلیل ہے چونکہ غامدی صاحب نزول عیسیٰ کا انکار کرتے ہیں اسی وجہ سے انہوں نے اس آیت کے عام حکم کو ختم کر کے خاص میں شامل کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

قرآن اور میزان

اصول غامدی:۔

قرآن مجید کے جتنے بھی نام ہیں یا تو ان کا ذکر قرآن مجید میں ملتا ہے یا نبی ﷺ کے فرامین میں ملتا ہے قرآن کو فرقان اور تنزیل وغیرہ کے نام سے موسوم کیا گیا لیکن غامدی صاحب کہتے ہیں قرآن کا ایک نام میزان بھی ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے اس آیت کو پیش کیا ہے **”اللہ الذی انزل الکتاب بالحق والمیزان** (الشوریٰ۴۲آیت۱۷)اس آیت کا ترجمہ غامدی صاحب نے یوں کیا ہے

”اللہ وہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری یعنی میزان نازل کیا ہے“۔

اسکی مزید وضاحت کرتے ہوئے غامدی صاحب رقمطراز ہیں: اس آیت میں ،والمیزان سے پہلے(و)تفسیر کے لئے ہے،اس طرح المیزان دراصل یہاں الکتاب ہی کا بیان ہے(اصول ومبادی میزان صفحہ۲۲۔۲۳)

جواب:۔

غامدی صاحب کا یہ موقف خود ساختہ ہے اور اس کی حیثیت شاذ کی طرح ہے کیونکہ ان سے پہلے اہل علم میں سے کسی محدث یا مفسر نے قرآن کے اس نام (میزان) کو بیان نہیں کیا اور نہ ہی کسی مفسر نے اس آیت کی تفسیر اس طرح بیان کی جیسا کہ غامدی صاحب نے اوپر بیان کی ہے عربی زبان میں لفظ (و) کی کئی اقسام ہیں لیکن جب لفظ (و) اگر کسی جگہ استعمال ہوتا ہے تو اس کا تعین کرنے کے لئے (کہ یہ (و) قسم کے لئے یا تفسیر کے لئے ہے) دلیل یا کسی قرینے کی ضرورت ہوتی ہے مثال کے طور پر قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے **”قد جآء کم من اللہ نور وکتاب مبین“** (المائدہ۵آیت۱۵)یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور یعنی کتاب مبین آئی ہے“ یہاں پر”نور کتاب“ کے درمیان میں جو (و) ہے تفسیر کے لئے ہے کیونکہ اس کی اگلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے”یھدی بہ اللہ“اللہ اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے“یہاں”بہ“ یعنی ضمیر مفرد مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نور اور کتاب ایک ہی چیز ہیں اور کتاب نور کی تفسیر ہے کیونکہ اگر نور اور کتاب دونوں الگ الگ چیزیں ہوتی تو”بہ“ کی جگہ ”بھما“ ہوتا یعنی ضمیر تثنیہ غائب کا صیغہ استعمال ہوتا۔

جس طرح یہاں دلیل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ لفظ (و) تفسیر کے لئے استعمال ہوا ہے غامدی صاحب کو یہ بھی چاہیے تھا کہ وہ دلیل کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت کرتے لیکن غامدی صاحب نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر بغیر دلیل سے کہہ رہے ہیں کہ ”والمیزان“ میں (و) تفسیر کے لئے استعمال ہوا ہے لہٰذا غامدی صاحب کی یہ بات کالعدم ہے کیونکہ اس کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔غامدی صاحب اگر قرآن کو غور سے پڑھتے اور اسلاف کے طریقے کو اپناتے تو یہ نوبت نہ آتی۔دوسروں کو تو غامدی صاحب قرآن مجید غور وفکر اور اسے بغیر کسی دوسری چیز کا سہارا

لئے بغیر پڑھنے کی ترغیب دے رہے ہیں لیکن خود ان کا عمل اسکے برعکس ہے۔''والمیز ان'' میں (و) عطف کے لئے اور مغایرت کے لئے استعمال ہوا ہے اس بات کی واضح دلیل سورہ حدید کی یہ آیت ہے۔ **''لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان''** (سورہ حدید ۵۷ آیت ۲۵) یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل فرمائی''

غامدی صاحب کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے لئے قرآن اتارا ہے جو در اصل ایک میزان عدل ہے تاکہ ہر شخص اس پر تول کر دیکھ سکے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا باطل اور تولنے کے لئے یہی چیز ہے اس کے علاوہ دنیا میں کوئی اور چیز نہیں جس پر اسے تولا جا سکے۔ (اصول ومبادی میزان صفحہ ۲۳)

سورہ حدید کی آیت نمبر ۲۵ جو ہم نے پیش کی ہے اس میں یہ بات واضح ہے کہ اللہ رب العزت نے دیگر رسولوں کے ساتھ بھی کتاب اور میزان کا نزول فرمایا۔

اگر والمیز ان میں (و) تفسیر کے لئے ہے تو نتائج اس طرح نکلتے ہیں۔

(۱) خاص قرآن ہی میزان نہیں رہ جاتا بلکہ دوسرے انبیاء پر جو کتابیں اتاری گئیں وہ بھی میزان بن جاتی ہیں۔

(۲) ان کتابوں پر بھی کسی چیز کو تول کر حق و باطل کا پتہ لگایا جا سکتا ہے

(۳) غامدی صاحب کی اس بات کا بھی رد ہوتا ہے قرآن کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر اسے تولا جائے۔

(۴) اور اگر قرآن ہی میزان ہے تو کیا اللہ تعالیٰ نے دیگر رسولوں پر بھی قرآن نازل کیا تھا؟ کیونکہ ان پر بھی کتاب و میزان کا نزول ہوا تھا۔

ایسی تفسیر جس سے بات کا بتنگڑ بن جائے اور خود انہی کی بات کا رد ہو جائے بے کار اور باطل ہے۔

صحیح بات یہی ہے کہ قرآن اور میزان دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں وگرنہ نتائج مذکورہ آپ کے سامنے ہیں ان نتائج کو کوئی ادنیٰ سا مسلمان بھی نہیں مانے گا یہاں تک کہ غامدی صاحب بھی نہیں مانیں گے۔

قرآن کی تحدید و تخصیص

اصول غامدی:۔

غامدی صاحب اپنے قواعد وضوابط کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: قرآن مجید کی یہ حیثیت، جو اس نے خود اپنے لئے ثابت قرار دی ہے لہٰذا اس کی بنیاد پر جو باتیں قرآن کے بارے میں بطور اصول ماننی چاہئے وہ یہ ہیں۔

پہلی یہ کہ قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی یہاں تک کہ خدا کا پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے ،اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا دین میں ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اس کی آیات بینات کی روشنی میں ہوگا (اصول ومبادی میزان صفحہ ۲۴)

اسی طرح کی بات کو غامدی صاحب نے حدیث اور قرآن کا باب باندھ کر بیان کیا ہے وہ رقمطراز ہیں: چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوء فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے اسی طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے (اصول ومبادی میزان ۳۶)

جواب:۔

یہاں پر بھی غامدی صاحب بغیر دلیل کے اصول بیان کررہے ہیں رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کی حدیث اگر قرآن میں کسی قسم کی تحدید وتخصیص یا نسخ نہیں کرسکتے تو اس بات کی کیا دلیل ہے۔ آخر یہ ایک بہت بڑا اصول ہے جو کو غامدی صاحب بیان کررہے ہیں لیکن اتنے بڑے اصول کو بیان کرنے کے بعد اسکی دلیل نہ دینا۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ غامدی صاحب کا خود ساختہ اصول ہے اگر غامدی صاحب کہیں کہ یہ اصول خود قرآن پاک نے بیان کیا ہے تو میں غامدی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ ایک قرآن کی ایسی آیت دکھا دیں جس میں یہ اصول بیان ہوا ہو؟؟؟

(۲) قرآن مجید میں وراثت کا عام حکم ہے چاہے کوئی وارث مسلمان ہو یا کافر اسی طرح کوئی مورث۔ لیکن غامدی صاحب نے اس حکم کی تخصیص کے لئے اس حدیث کو پیش کیا ہے "**لا یرث المسلم الکافر ولاالکافر المسلم**" نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ کافر کسی مسلمان کے۔ (اصول ومبادی میزان ۴۱)

اسی طرح قرآن مجید میں ہے " **والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما** ۔۔۔ (المائدہ ۵ آیت ۳۸)

ترجمہ: "چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو"

اب یہ حکم عام ہے چاہے چوری کسی قسم کی ہو یا کسی چیز کی ہو تھوڑی ہو یا زیادہ لیکن غامدی صاحب نے اس حکم کی بھی تخصیص کے لئے اس حدیث کو پیش کیا ہے "**لا قطع فی ثمر معلق ولافی حریسة جبل ، فاذا آواہ المراح اوالبحرین فالقطع فیما یبلغ ثمن المجن** (المؤطا، ۱۵۱۸)

"میوہ درخت پر لٹکتا ہو یا بکری پہاڑ پر چرتی ہو اور کوئی اسے چرا لے تو اس میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔ ہاں اگر بکری باڑے میں پہنچ جائے اور میوہ کھلیان میں آجائے تو ہاتھ کاٹا جائے بشرطیکہ اس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر نہ ہو" (اصول ومبادی میزان ۴۴)

اور قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے "**حرمت علیکم المیتة**" تم پر مردار حرام کر دیا گیا (المائدہ ۵ آیت ۳) یہ حکم بھی عام ہے جبکہ غامدی صاحب اس حکم کی تخصیص اس حدیث سے کررہے ہیں "تمہارے لئے دو مردے حلال ہیں مچھلی اور ٹڈی (اصول ومبادی میزان ۴۲)

ایک طرف غامدی صاحب اس بات کا انکار کررہے ہیں کہ کوئی وحی خفی یا جلی یا رسول اللہ ﷺ خود قرآن کی تخصیص وتحدید کریں۔ اور پھر خود رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے ذریعے قرآن کی تخصیص کررہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب اس بات کو مانتے ہیں کہ نبی ﷺ قرآن کی تخصیص وتحدید کرسکتے ہیں اگرچہ وہ اس کو تخصیص وتحدید کے بجائے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اس کی مدعا کی تعبیر ہے جو قرآن کے الفاظ میں مضمر ہے (اصول ومبادی میزان ۴۱) یہ صرف اس وجہ سے کہ اس بات کو مانا جائے جو ان کے نظریہ یا مطلب کے مطابق ہو، کیونکہ اگر کان دائیں طرف سے پکڑیں یا بائیں طرف سے بات ایک ہی ہے پکڑا کان ہی کو جا رہا ہے اسی طرح غامدی صاحب حدیث سے قرآن کی تخصیص کو مان رہے ہیں لیکن اس کو نام دوسرا دے رہے ہیں۔

(۳) غامدی صاحب حدیث سے تو قرآن کی تخصیص کا انکار کررہے ہیں جبکہ انسانی فطرت کو اس کی تخصیص کا حق دے رہے ہیں مثال کے طور پر قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے (سورہ انعام ۶ آیت ۱۴۵)

قل لااجد فی ما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمه الا ان یکون میتة او دما مسفوحا اولحم خنزیر فانه رجس اوفسقا اهل لغیر الله به (سورہ انعام ۶ آیت ۱۴۵)

ترجمہ: کہہ دو میں تو اس وحی میں جو میری طرف آئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی چیز جو وہ کھاتا ہے حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت" یقیناً یہ

ناپاک ہے یا اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے غیر اللہ کے نامزد کردیا گیا ہو۔

لیکن غامدی صاحب نے اس کے علاوہ جو محرمات ذکر کئے ہیں جیسا کہ۔ چیتا، شیر، گدھا وغیرہ کی تحریم کے لئے یہ کہا کہ انسان کی یہ فطرت بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے (اصول ومبادی میزان ۳۷)

جب بقول غامدی صاحب کے کہ خدا کا پیغمبر جس پر قرآن نازل ہوا ہے اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص نہیں کرسکتا تو عام انسان کی فطرت کو یہ حق کس نے دیا کہ قرآن کے کسی حکم کی تخصیص کرے؟؟

(۴) اگر اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے طرف سے قرآن کی تخصیص یا اسکے کسی حکم کو منسوخ کرتے تو غامدی صاحب کی بات سمجھ میں آتی تھی .لیکن اللہ رب العزت قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے "**وما ينطق عن الهوى ، ان هو الا وحي يوحى**" نبی اکرم ﷺ اپنی خواہش سے نہیں بولتے مگر وہی بولتے ہیں جو (اللہ کی طرف سے) ان پر وحی ہوتی ہے۔ (سورہ نجم ۵۳ آیت ۴،۳) دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے "**قل انما اتبع ما يوحى الى**" کہہ دیجئے میں صرف اس بات کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر (اللہ کی طرف سے) وحی کی جاتی ہے۔ (سورہ اعراف ۷ آیت ۲۰۳)

لہٰذا یہ بات عیاں ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کرتے تھے اور نہ ہی کوئی عمل کرتے تھے لیکن جب اللہ کی طرف سے وحی ہوتی تو آپ بولتے تھے اور عمل کرتے تھے اور اس بات میں کوئی قباحت نہیں کہ اللہ اپنے کسی وحی کردہ حکم کی تخصیص اور اسکا نسخ اپنے کسی دوسرے وحی کردہ حکم سے اپنے نبی ﷺ کے ذریعے کروادے۔

اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے:

وما جعلنا القبلة التي كنت عليها الا لنعلم من يتبع الرسول ممن ينقلب على عقبيه" (سورہ بقرۃ ۲ آیت ۱۴۲)

ترجمہ: ہم نے پہلا قبلہ (بیت المقدس) اس لئے بنایا تھا کہ تا کہ ہم جانیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں ملے گا کہ اللہ رب العزت نے مسلمانوں کو بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو قرآن کے علاوہ بھی احکامات دیا کرتا تھا۔ اور جب اللہ رب العزت مسلمانوں کو قرآن کے علاوہ اپنے نبی ﷺ کے ذریعے کسی چیز کا حکم دے سکتا ہے تو قران کے علاوہ کسی حکم سے اپنے نبی کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تخصیص یا اس کا نسخ کیوں نہیں کروا سکتا۔

قرأت میں اختلافات اور غامدی صاحب کے افترأات

اصول غامدی:۔

غامدی صاحب اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے خودساختہ اصول بیان کررہے ہیں" پہلا سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے اور جسے مغرب کے چند علاقوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں امت مسلمہ کی عظیم اکثریت اس وقت تلاوت کررہی ہے یہ تلاوت جس قرأت کے مطابق کی جاتی ہے اس کے سوا کوئی قرأت نہ قرآن ہے اور نہ اسے قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ (اصول ومبادی میزان ص ۲۶)
اس کے بعد غامدی صاحب نے قرآن کی کچھ آیتیں پیش کی ہیں۔

(۱) سنقرئك فلا تنسىٰ ، الا ما شاء الله ، انه يعلم الجهر ومايخفى ' (سورہ الاعلیٰ آیت ۶،۷)

''عنقریب (اسے) ہم (پورا) تمہیں پڑھادیں گے تو تم نہیں بھولوگے، مگر وہی جو اللہ چاہے

گا، وہ بے شک جانتا ہے اس کو بھی جو اس وقت (تمہارے) سامنے ہے اور اسے بھی جو (تم سے) چھپا ہوا ہے،

(۲) لا تحرك به لسانك لتعجل به ، ان علينا جمعه وقرآنه ،فاذا قرأنه فاتبع قرآنه ، ثم ان علينا بيانه ،(سورہ القیامہ۔آیت ۱۹۔۱۶)

اس (قرآن) کو جلد پالینے کے لئے (اے پیغمبر) اپنی زبان کو اس پر جلدی نہ چلاؤ اس کو جمع کرنا اور سنانا یہ سب ہماری ہی ذمہ داری ہے۔اس لئے جب ہم اس کو پڑھ چکیں تو (ہماری) اس قرأت کی پیروی کرو پھر ہمارے ہی ذمہ ہے کہ (تمہارے لئے اگر کہیں ضرورت ہو تو) اس کی وضاحت کردیں۔(اصول ومبادی میزان ۲۶)

جواب:۔

غامدی صاحب قرآن پاک کے ترجمہ میں خیانت سے کام لے رہے ہیں، انہ یعلم الجھر ، کا ترجمہ کر رہے ہیں، وہ بے شک جانتا ہے اس کو بھی جو اس وقت (تمہارے) سامنے ہے۔'' غامدی صاحب یہ ''اس وقت کس لفظ کا ترجمہ ہے۔

اسی طرح غامدی صاحب '**ثم ان علینا بیانه**' کا ترجمہ اس طرح کر رہے ہیں'' پھر ہمارے ہی ذمہ ہے کہ (تمہارے لئے اگر کہیں ضرورت ہو تو)

اس کی وضاحت کردیں' (تمہارے لئے اگر کہیں ضرورت ہو تو) کس عبارت کا مفہوم ہے یا کونسا ایسا قرینہ ہے جس سے اس عبارت کا استنباط کیا ہے۔

دراصل بات یہ ہے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی اسکیم کے مطابق قرآن کا ترجمہ کرتے ہیں یا قرآن کو اپنے نظریہ کے مطابق ڈھال لیتے ہیں غامدی صاحب نے بھی یہاں کچھ اسی طرح کیا ہے حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے کہ قرآن وسنت کے مطابق اپنے نظریہ کو بنایا جائے نہ کہ قرآن وسنت کو اپنے نظریئے کے مطابق ڈھالا جائے۔

اصول غامدی:۔

آگے غامدی صاحب رقمطراز ہیں: ان آیتوں میں قرآن کا نزول اور اس کی ترتیب وتدوین سے متعلق اللہ تعالیٰ کی جو اسکیم بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے (ایضا،۲۶،۲۷)

تنبیہ: یہاں پر ہم غامدی صاحب کی اس اسکیم سے متعلق انہی باتوں کا ذکر کریں گے جو انہوں نے اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگائی ہیں۔

غامدی صاحب فرماتے ہیں: اس کی جو قرأت اس کے زمانہ نزول میں اس وقت کی جارہی ہے اس کے بعد اس کی ایک دوسری قرأت ہوگی اس موقع پر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اس میں سے کوئی چیز اگر ختم کرنا چاہیں گے تو اسے ختم کرنے کے بعد یہ آپ کو اس طرح پڑھا دیں گے کہ اس میں کسی سہو ونسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا اور اپنی آخری صورت میں بالکل محفوظ آپ کے حوالے کردیا جائے گا۔

ثانیاً: آپ کو بتایا گیا ہے کہ یہ دوسری قرأت قرآن کو جمع کرکے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کردینے کے بعد کی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی آپ اس کے پابند ہو جائیں گے کہ آئندہ اسی قرأت کی پیروی کریں گے اس کے بعد اس سے پہلے کی قرأت کے مطابق اس کو پڑھنا آپ کے لئے جائز نہ ہوگا۔

ثالثاً: یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کے کسی حکم سے متعلق اگر شرح ووضاحت کی ضرورت ہوگی تو وہ بھی اس موقع پر کردی جائے گی اور اس طرح یہ کتاب خود اس کے نازل کرنے والے ہی کی طرف جمع وترتیب اور تفہیم وتبیین کے بعد ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے گی۔(ایضاً،۲۷)

جواب:۔

قارئین کرام کتنے ہی افسوس کی بات ہے کہ غامدی صاحب اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے کس طرح اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہے ہیں ۔ غامدی صاحب اگر آپ قرأت سبعہ جو کہ متواتر ہیں کو نہیں مانتے تو اس کا انکار اس طرح کر دیتے جس طرح آپ کے اکابر نے کیا۔قرآن پر جھوٹ باندھنے کی کیا ضروت تھی کاش اگر غامدی صاحب اس جھوٹ کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر افتراء کرنے سے پہلے قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھ لیتے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

:فمن اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا ،(الزمر آیت۔۳۲)

اس سے زیادہ ظالم اور کون ہوسکتا ہے جواللہ پر جھوٹ باندھے“۔

غامدی صاحب کہتے ہیں اگر قرآن کو کوئی غور وتدبر سے پڑھے تو خود ہی قرآن کی روشنی میں ہر چیز کی وضاحت ہوجاتی ہے اور پھر قرآن کے بعد کسی چیز کی وضاحت کی ضروت نہیں پڑھتی اور بقول غامدی صاحب ان آیتوں میں جو اسکیم بیان ہوئی ہے اس کی وضاحت کر رہے ہیں جب قرآن سے باہر اس کی وضاحت کے لئے کسی چیز کی ضروت نہیں تو غامدی صاحب نے اس اسکیم کی وضاحت کیوں کی جو بقول غامدی صاحب ان آیتوں میں بیان ہوئی ہے؟ جتنا بھی قرآن کو غور وتدبر سے پڑھ لیا جائے پھر بھی غامدی صاحب کی بیان کردہ اسکیم کی معرفت نہیں ہوگی کیونکہ یہ غامدی صاحب کی خود ساختہ اسکیم ہے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف منسوب کر دی۔

غامدی صاحب نے اپنے اس موقف کی تائید میں آگے ایک حدیث کا ذکر کیا ہے ”ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں:

کا ن یعرض علی النبی ﷺ القرآن کل عام مرۃ فعرض علیہ مرتین فی العام الذی قبض فیہ (بخاری رقم ۴۷۱۲)

رسول اللہ ﷺ کو ہر سال ایک مرتبہ قرآن پڑھ کر سنایا جاتا تھا،لیکن آپ کی وفات کے سال یہ دومرتبہ آپ کو سنایا گیا۔

(اصول ومبادی میزان ۲۷)

غامدی صاحب نے اس روایت کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی ﷺ کو جس قرأت سے آپ کی وفات کے سال قرآن سنایا گیا وہ یہی قرأت ہے جو مصحف میں ثبت ہے اور جسے ہم قرأت حفص یا عامہ کہتے ہیں اور اس کے علاوہ جو قرأتیں ہیں ان کو ماننا یا ان قرأتوں میں قرآن پڑھنا اب جائز نہیں۔

اور پھر غامدی صاحب نے اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے ”البرہان“ کے حوالے سے ابو عبدالرحمان السلمی کا قول ذکر کیا ہے۔

”کانت قرأۃ ابی بکر وعمر وزید بن ثابت والمھاجرین والانصار واحدۃ ۔۔۔الخ“(البرھان الزرکشی ۱/۲۳۷)

ابوبکر وعمر عثمان زید بن ثابت اور تمام مہاجرین وانصار کی قرأت ایک ہی تھی وہ قرأت عامہ کے مطابق قرآن پڑھتے تھے۔یہ وہی قرأت ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات کے سال جبریل امین کو دومرتبہ قرآن سنایا،عرضہ اخیرہ کی اس قرأت میں زید بن ثابت بھی موجود تھے۔دنیا سے رخصت ہونے تک وہ لوگوں کو اسی کے مطابق قرآن پڑھاتے تھے۔

(اصول ومبادی میزان ۲۸)

اسی طرح ابن سیرین کا ”الاتقان“ کے حوالے سے ایک قول ذکر کیا ہے” **القرأۃ الذی عرضت علی النبی ﷺ فی العام الذی۔۔۔الخ** (الاتقان، السیوطی ۱/۵۰۹) نبی ﷺ کو آپ کی وفات کے سال جس قرأت پر قرآن سنایا گیا یہ وہی قرأت ہے جس کے مطابق لوگ اس وقت بھی قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں۔(اصول ومبادی میزان،۲۹)

(۱) ان اقوال میں یہ بات واضح ہے کہ آخری مرتبہ جس قرأت کے مطابق نبی ﷺ نے

جبریل امین سے دور کیا وہ قرأت عامہ تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہے۔اس عرضہ اخیرہ کی قرأت کے علاوہ بھی نبی ﷺ نے عرضہ اخیرہ سے پہلے دوسری قرأتوں میں جبریل امین سے قرآن کا دور کیا کیونکہ اگر قرآن ایک ہی قرأت ہوتی تو وفات کے سال میں قرآن کا جو دور ہوا اس میں عرضہ اخیرہ کی وضاحت کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا مطلب ہے کہ اس سے پہلے بھی عرضہ اخیرہ کی قرأت کے علاوہ بھی کچھ قرأتیں موجود تھی اور شاید غامدی صاحب بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔لیکن وہ کہتے ہیں صحابہ اور تابعین کے تواتر سے صرف عرضہ اخیرہ کی قرأت منقول ہے لہٰذا دیگر قرأتوں کا کوئی جواز نہیں۔اور یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے کیونکہ جتنے بھی دلائل یا اقوال غامدی صاحب نے ذکر کئے ہیں ان میں کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں کہ باقی کی قرأتیں منع ہوگئیں یا اب ان کا پڑھنا حرام ہوگیا۔

۲) غامدی صاحب کوئی ایک ایسی واضح دلیل پیش کریں جس سے یہ بات ثابت ہوجائے کہ ایک قرأت کے علاوہ تمام قرأتیں منسوخ ہیں؟

(۳) غامدی صاحب نے ''البرھان'' اور ''الاتقان'' کے حوالے سے اقوال پیش کئے ہیں لیکن ان دونوں کتابوں کو غور سے نہیں پڑھا پڑھتے تو یہ نوبت نہ آتی غامدی صاحب نے (البرھان کے حوالے سے ابوعبدالرحمان السلمی کا قول تو پیش کردیا لیکن اس قول کو نہیں دیکھا جو امام زرکشی نے اپنی کتاب میں اس طرح بیان کیا ہے '' **القراء ت السبع کلھا صحت عن رسول** ﷺ ''(البرھان الزرکشی ج ا ص ۲۲۷)

''ساتوں قرأتیں رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت ہیں'' اسی طرح صاحب برھان امام زرکشی نے قرأت سبعہ پر مسلمانوں کا اجماع ذکر کیا ہے فرماتے ہیں '' **وقد اجمع المسلمون علی الاعتماد فی ھذہ الاعصار علی ما صح عنھم** ''(البرھان ج ا ص ۲۲۷) جس قرأت کی ان (سات اماموں) سے صحت ثابت ہوجائے اس پر تمام اس زمانے کے مسلمانوں کا اعتماد کرتے ہیں۔

اسی طرح غامدی صاحب نے ''الاتقان'' کے حوالے سے اپنے مطلب کے اقوال تو نقل کردیئے لیکن ان اقوال کو نظر انداز کردیا جو ان کے نظریہ کے خلاف ہے۔جیسا کہ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:

'' قال الدّانی وائمة القرا ء ة لاتعمل فی شئی من حروف القرآن علی الافشی فی اللغة والا قیس فی العربیة بل علی الاثبت فی الأ ثر ، والاصح فی النقل ، واذا ثبتت الروایة لم یردھا قیاس عربیة ولافشولغة ،لا ن القراء ة سنة متبعة ،یلزم قبولھا والمصیر الیھا''

(الاتقان جلد ا ص ۱۵۳)

ترجمہ:

''دانی فرماتے ہیں کہ جن قرأت کے امام قرآن کے کسی حرف میں زبان کے مشہور طریقہ اور عربیہ کے قیاس قاعدہ پر ہرگز عمل نہیں کرتے بلکہ وہ روایت کے ذریعے سے ثابت شدہ اور نقل کے واسطہ سے صحیح مانی ہوئی بات تسلیم کرتے ہیں اور روایت کا ثبوت بہم پہنچنے کی صورت میں اسے زبان دانی سے مشہور تلفظ اور عربیت کے قواعد کوئی بھی رد نہیں کرسکتے کیونکہ قرأت ایک ایسی سنت متبعہ ہے جس کا قبول کرنا لازم اور اس پر چلنا واجب ہے آگے امام سیوطی کہتے ہیں '' قلت أخرج سعید بن منصور فی سننه عن زید بن ثابت قال: القرأة سنة متبعة''

(الاتقان جلد ا ص ۱۵۳۔سنن سعید بن منصور جلد ۲ کتاب فضائل القرآن حدیث ۶۸ صفحہ ۲۶ متبعة کا لفظ سنن سعید بن منصور میں نہیں ہے بلکہ سنن بیہقی میں امام بیہقی نے اسے روایت کیا ہے دیکھئے سنن بیہقی جلد ۲ صفحہ ۵۳۹ حدیث ۳۹۹۵ کتاب الصلوۃ باب وجوب القرأة علی ماانزل من الاحرف السبعة)

ترجمہ:

''میں کہتا ہوں کہ (اس موقف کی تائید میں) سعید بن منصور نے اپنی سنن میں زید بن ثابت سے روایت کی ہے، کہ قرأت ایک پیروی کی جانے والی سنت ہے لہٰذا غامدی صاحب کا یہ کہنا کہ قرأت عامہ کے علاوہ تمام قرأتیں غلط ہیں ان کی کم علمی کا نتیجہ ہے۔

کیونکہ ایک دو قول پڑھنے سے مسئلہ کا نتیجہ نہیں نکلتا۔ آگے غامدی صاحب کہتے ہیں '' قرآن مجید پر اگر اس کے نظم کی روشنی میں تدبر کیا جائے تو اس کے داخلی شواہد بھی پوری قطعیت کے ساتھ یہی فیصلہ سناتے ہیں (اصول ومبادی میزان ۲۹)

غامدی صاحب بہت ہی عجیب وغریب بات کر رہے ہیں اگر قرآن کے داخلی شواہد سے صرف اسی قرأت عامہ کی معرفت ہوتی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب غامدی صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس قرأت عامہ کے علاوہ بھی قرأت تھی تو کیا نبی ﷺ اور صحابہ کے زمانے میں دوسرا قرآن تھا؟ یا یہ داخلی شواہد صحابہ کو جو عربی لغت کے ماہرین تھے معلوم نہ ہوسکے؟ لیکن آج ۱۴ سو سال بعد ایک غیر عربی شخص نے معلوم کر لئے؟

غامدی صاحب کا ان قرأتوں پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ مختلف قرأت سے معنی بھی مختلف ہو جاتے ہیں یہ بھی غامدی صاحب کے اغلاط میں سے ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی لفظ کو مختلف پڑھنے سے اسکے معنی مختلف یا تبدیل نہیں ہوتے بلکہ معنی ایک ہی رہتے ہیں (فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۳۴)

اسی طرح امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں ابن سیرین کا قول نقل کیا ہے (دیکھئے بیہقی سنن کبریٰ جلد ۲ صفحہ ۳۹)

مثال کے طور پر قرآن مجید میں ہے '' **مالك يوم الدين** '' اس کو ''**مَلِك يوم الدين** بھی پڑھا گیا اور یہ دونوں قرأتیں متواتر ہیں (تفسیر القرطبی جلد ۱ صفحہ ۱۳۰ و تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۲۵ و تفسیر الطبری جلد ۱ صفحہ ۹۸) لیکن ان قرأتوں میں معنی تبدیل نہیں ہوئے۔

غامدی صاحب اور حدیثِ سبعہ احرف

اصول غامدی:۔

غامدی صاحب نے حضرت عمر اور ہشام بن حکیم کا واقعہ ذکر کیا ہے اور اس پر تنقید کی ہے۔
غامدی صاحب اس قصہ کو نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں: اس روایت کے بارے میں ذیل کے چند حقائق اگر پیش نظر ہیں تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک بالکل ہی بے معنی روایت ہے جسے اس بحث میں ہرگز قابل اعتنا نہیں سمجھنا چاہئے۔

اول یہ کہ یہ روایت اگرچہ حدیث کی امہات کتب میں بیان ہوئی ہے لیکن اس کا مفہوم ایک ایسا معما ہے جسے کوئی شخص اس امت کی پوری تاریخ میں کبھی حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ امام سیوطی نے اس کی تعیین میں چالیس کے قریب اقوال اپنی کتاب ''الاتقان'' میں نقل کئے ہیں (اصول ومبادی میزان ۳۰)

جواب:۔

غامدی صاحب نے اس کے آگے تنویر الحوالک کے حوالے سے سیوطی کا قول نقل کر کے اسے متشابہات میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کسی چیز کے تعیین میں اگر اقوال کی کثرت ہو تو ہرگز اسکا مطلب یہ نہیں کہ یہ چیز حل نہ ہوسکی ہو مثال کے طور پر

سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت میں ہے '' **رب العالمین** '' امام قرطبی فرماتے ہیں

’’ **اختلف اهل التأويل فى (العالمين) اختلافا كثيرا** ، (تفسیر القرطبی جلد اص ۱۲۸) مفسرین کا لفظ (العالمین) کے تعین میں بہت اختلاف ہے اور اسکے تعین میں امام قرطبی نے چند اقوال بھی ذکر کئے ہیں کیا غامدی صاحب ان آیت کے بارے میں یہی کہیں گے کہ اسے حل نہیں کیا جا سکا یا یہ متشابہات میں سے ہے؟

اسی طرح سورۃ البقرۃ کی آیت میں ۲۳۸ میں ’’ **الصلوة الوسطى** ‘‘ کی تعین میں اٹھارہ یا اس سے زائد اقوال مفسرین نے ذکر کئے ہیں۔ دیکھئے (تفسیر القرطبی جلد ۲ ص ۱۵۸ اور فتح القدیر للشوکانی جلد اس ۲۵۶) لیکن اس لفظ ’’صلاۃ وسطی‘‘ کے تعین میں اقوال کی کثرت ہونے سے کیا یہ غیر حل شدہ آیت ہوگئی یا متشابہات آیت ہوگئی؟

کسی دین کے مسئلہ میں اگر اختلاف ہو جائے تو اسکا حل بھی موجود ہے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے (سورہ نساء آیت ۵۹)

’’**فان تنازعتم فى شئى فردوه الى الله والرسول** ‘‘

اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور اسکے رسول کی طرف لوٹا دو

لہٰذا اگر کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس کا حل یہی ہے کہ قرآن وسنت کی طرف رجوع کیا جائے۔ اگر کوئی کسی چیز میں کثرت اختلاف کی وجہ سے اسکے حل کا انکار کر دے تو گویا اس نے قرآن کریم کی اس آیت کا انکار کر دیا۔

جس طرح ان آیتوں میں اختلاف کے باوجود مفسرین اس اصول سے ان آیتوں کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اسی طرح سبعہ احرف والی حدیث کے تعین میں اختلاف کے باوجود محدثین ومفسرین اور اھل علم کی جماعت اس اصول سے اسکو حل کرنے میں کامیاب ہوگئی جیسا ابن عبدالبر نے التمھید میں اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور ابن جریر الطبری نے تفسیر الطبری میں ذکر کیا ہے۔

دیکھئے (تفسیر الطبری ج اص ۳۵، ۵۲، اور فتح الباری ج ۹ ص ۲۷، ۴۶، اور التمھید شرح مؤطا ج ۳ ص ۶۲۵، ۶۵۴)

دوسری بات یہ کہ لوگوں کی سمجھ میں حدیث نہ آنے سے یا اس میں اختلاف کرنے سے حدیث غلط نہیں ہو جاتی جس طرح قرآن کی کوئی آیت لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے یا اس آیت کے تعین میں لوگ اختلاف کریں تو قرآن کی آیت غلط نہیں ہو جاتی۔

اعتراض غامدی:۔

آگے غامدی صاحب نے فرما رہے ہیں ’’کہ دوم یہ کہ اس کی واحد معقول توجیہ اگر کوئی ہوسکتی تھی کہ سبعہ احرف کو اس میں عربوں کے مختلف لغات اور لہجوں پر محمول کیا جائے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ روایت کا متن ہی اس کی تردید کر دیتا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ ھشام اور عمر فاروق جن دونوں بزرگوں کے مابین اختلاف کا ذکر اس روایت میں ہوا ہے وہ دونوں قریشی ہیں جن میں ظاہر ہے کہ اس طرح کے کسی اختلاف کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ (اصول ومبادی میزان ۳۱)

جواب:۔

حیرت کی بات ہے غامدی صاحب اس حدیث کو غور سے پڑھنے کے باوجود اسے صحیح طرح سمجھ نہ پائے۔

اگر چہ یہ دونوں صحابی قریشی تھے لیکن یہ قرآن کی قرأت یا تلاوت اپنی مرضی کے طریقے یا اپنی قوم کے اہل لغت کے کہنے پر نہیں پڑھ رہے تھے۔ بلکہ اس حدیث میں وضاحت ہے کہ حضرت عمر کہہ رہے ہیں ’’**وكان رسول الله** ﷺ **اقرأ نيها**‘‘ مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ (سورہ فرقان) خود پڑھائی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اپنی مرضی کے طریقے

سے قرآن کریم کی تلاوت نہیں کیا کرتے تھے بلکہ جس طریقے سے رسول اللہ ﷺ قرآن کی تلاوت سکھاتے اسی طریقے سے وہ قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے''ویعلمھم الکتاب''(ال عمران آیت ۱۶۴)

اور رسول اللہ ﷺ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں اس تعلیم میں قرآن پڑھنا اور سمجھنا دونوں باتیں شامل ہیں۔لہٰذا اگر رسول اللہ ﷺ نے دونوں قریشی صحابہ کو الگ الگ طریقے سے قرآن پڑھنا سکھا دیا تو اس میں نا سمجھنے والی کون سی بات ہے کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہوا کہ رسول اللہ نے صحابہ کو ایک ہی طریقے سے قرآن کی تلاوت سکھائی ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی آسانی کے لئے قرآن کو سبعہ احرف میں نازل کیا تا کہ جسے جس طریقے سے آسانی لگے اس طریقے سے قرآن کو پڑھ لے چاہے اسکے قبیلے کا وہ لہجہ ہو یا نہ ہو۔

اعتراض غامدی:۔

اسی صفحہ پر غامدی صاحب کہتے ہیں کہ اس حدیث میں ''انزل'' کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ یہ بات واضح ہے قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے۔یہ بھی غامدی صاحب کی غلط فہمی ہے۔

جواب:۔

ابن عبدالبر ''التمھید مؤطا ''کی شرح میں فرماتے ہیں'' **قال ابو عمر قول ما قال : ان القرآن نزل بلغة قريش معنا عندى فى الاغلب** '' (التمھید جلد۳ص۲۳۰)

ابوعمر کہتے ہیں کہ کسی کا یہ کہنا قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا میرے نزدیک اس کے معنی ہیں کہ اکثر وبیشتر قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا (نہ کہ پورا قریش کی زبان میں نازل ہوا

)اس بات کی وضاحت اس روایت سے بھی ہوتی ہے حضرت عثمانؓ نے دیگر صحابہ کرامؓ اور زید بن ثابتؓ سے کہا اگر تمہارے اور زید بن ثابت کے درمیان اختلاف ہو جائے تو اس کو قریش کی زبان میں لکھو کیونکہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے (سنن الکبری للبیھقی ج۲ ص ۵۳۸ رقم ۳۹۹۳) اس سے معلوم ہوا کہ قریش کی زبان کے علاوہ بھی قرآن کا نزول ہوا ہے کیونکہ اگر قرآن صرف قریش کی زبان میں نازل ہوتا تو اختلاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

اعتراض غامدی:۔

غامدی صاحب کا اس حدیث پر چوتھا اعتراض یہ ہے کہ ھشام بن حکیم فتح مکہ کے دن ایمان لائے۔تو اتنے عرصہ قرآن سبعہ احرف میں نازل ہوتا رہا لیکن جلیل القدر صحابہ یہاں تک حضرت عمرؓ بھی اس بات کا علم نہیں رکھتے تھے اور فتح مکہ کے بعد انہیں اس بات کا علم ہوا یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی بڑی بات اتنے عرصے تک صحابہ عظام سے چھپی ہوئی ہو؟

جواب:۔

غامدی صاحب یہاں بے جا بات کر رہے ہیں حالانکہ یہ کوئی ناممکن بات نہیں کیونکہ صحابہ کرام کو بتدریج دینی احکامات کی معرفت ہوئی ہے۔

مثال کے طور پر حضرت عمرؓ نے پاگل زانی عورت پر حد لگانے کا حکم دیا۔تو حضرت علی نے کہا اے امیر المؤمنین کیا آپ نہیں جانتے کہ کہ تین قسم کے اشخاص مرفوع القلم ہیں (یعنی ان پر کوئی حد نہیں) جس میں ایک پاگل ہے یہاں تک اسے عقل نہ آجائے یہ حدیث سننے کے بعد حضرت عمرؓ نے اس پاگل عورت کو چھوڑ دیا (ابوداؤد مع بذل المجھود کتاب الحدود جلد۱۲ص۲۷۲،۲۷۳،۲۷۴)

اسی طرح سبعہ احرف والی بات کا علم حضرت عمر کو کافی عرصہ بعد ہوا تو اس میں کونسی بڑی بات ہے جو تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

امام ابن شہاب الزھریؒ پر طعن

تنقید غامدی:۔

غامدی صاحب اس روایت کی سند سے متعلق رقمطراز ہیں: صحاح میں یہ اصلاً ابن شہاب زھری کی وساطت سے آئی ہیں۔ائمہ رجال انہیں تدلیس اور ادراج کا مرتکب تو قرار دیتے ہی ہیں (اصول ومبادی میزان ۳۱)

جواب:۔

اصول حدیث میں یہ بات واضح ہے کہ راوی پر جرح کردہ ایک دو اقوال کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ تمام اقوال اور راوی کے پورے حالات کو دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے ۔لیکن غامدی صاحب نے اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بغیر کسی دلیل کے امام فی الحدیث ابن شہاب الزھریؒ کو مجروح قرار دے دیا۔

مکحولؒ فرماتے ہیں کہ ابن شہاب سے زیادہ سنت کو جاننے والا کوئی نہیں تھا۔
ھذلیؒ کہتے ہیں کہ میں حسنؒ اور ابن سیرینؒ کے ساتھ بیٹھا لیکن میں نے زھری جیسا کسی کو نہیں دیکھا۔

سلیمان بن حبیب المحاربیؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا اگر تمہارے پاس زھریؒ کی سند سے کوئی روایت آئے تو اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لو۔(التمھید شرح موطا جلد۳ص۴،۶)
ابن المدینیؒ فرماتے ہیں حجاز میں علم ثقات کا دارومدار زھریؒ اور عمرو بن دینارؒ پر ہے (تذکرۃ الحفاظ جلد۱ص۱۳۹)

ابو عمرؒ کہتے ہیں کہ ابن شہابؒ علماء تابعین اور فقھاء میں سے ہیں اور حفظ واتقان میں سب سے مقدم ہیں (التمھید جلد۳ص۳)

ابن شہاب الزھریؒ کے مناقب اور ان کی توثیق میں ائمہ رجال کے اتنے اقوال ہیں اگر انہیں نقل کر دیا جائے تو ایک مکمل کتاب تیار ہو جائے گی۔

اگر غامدی صاحب ان اقوال کا مطالعہ کر لیتے تو ابن شہاب کی اہمیت وفضیلت کو جان لیتے اور ان پر طعن نہ کرتے۔

اور حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ اپنے نظریہ کے خلاف حدیث کو ابن شہاب الزھری کی وجہ سے رد کر رہے ہیں جبکہ وراثت میں اس حدیث '' نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہونگے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے'' سے استدلال کیا ہے جبکہ یہ روایت بھی ابن شہاب کے طریقے سے صحیح بخاری میں موجود ہے اس سے مزید غامدی صاحب کی مطلب پرستی کی وضاحت ہوتی ہے کہ جب چاہا اپنی مرضی سے ابن شہاب الزھریؒ کی بیان کردہ حدیث کو مان لیا اور جب چاہا انکار کر دیا۔

آگے غامدی صاحب نے اعلام الموقعین کے حوالے سے لیث بن سعد کا ابن شہابؒ کے بارے میں ایک قول نقل کیا ہے جسکا مختصر مفہوم یہ ہے کہ ابن شہابؒ جب مسائل میں لیث بن سعد سے گفتگو کرتے تو ان کی رائے تین قسم کی ہوتی اور تینوں میں آپس میں تناقض ہوتا ہے اور انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ پہلے کیا کہہ رہے تھے اور اب کیا کہہ رہے ہیں (اصول ومبادی میزان ۳۲)

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے راوی کی حدیث کو ترک کر دیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے اس بات کا تعلق ان کی رائے کے ساتھ ہے نہ کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے ساتھ اور اس بات کی وضاحت ہم کر چکے ہیں کہ حفظ احادیث میں آپ کا حافظہ بہت تیز تھا اور حدیث کو اسی طرح بیان کرتے جس طرح حدیث ہوتی اور یہ بات کوئی دور نہیں کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قرآن کے حافظ ہوتے ہیں کسی بھی آیت کے بارے میں ان سے پوچھا جائے تو فوراً بتا دیتے ہیں جبکہ دوسری طرف کوئی چیز رکھ کر بھول جاتے ہیں ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے وہ چیز کہاں رکھی ہے۔

تیسری بات غامدی صاحب ابن شہابؒ کو یہ بات کہہ کر طعن کر رہے ہیں کہ اگر وہ کسی چیز کا جواب دیتے تو تین طرح کا ہوتا اور جن میں سے ہر ایک دوسرے کا نقیض ہوتا اور انہیں اس بات کا احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ اس سے پہلے کیا کہہ چکے ہیں اور اب کیا کہہ رہے ہیں۔

جبکہ یہ طعن خود غامدی صاحب کی ذات پر انہی کی زبان سے ہو رہا ہے کیونکہ غامدی صاحب کی خود کی ہر ایک بات دوسرے نقیض کی ہوتی ہے اور انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں کہ وہ کیا کہہ چکے ہیں اور اب کیا کہہ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ غامدی صاحب کہہ رہے ہیں کہ یہ بات کس طرح کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر قطعی ہیں؟ امام رازی نے اس سوال کی تقریر اپنی تفسیر اسی طرح کی ہے ''**دلالة الالفاظ علی معانيها ظنية**'' الفاظ کی دلالت ان کے مفہوم پر ظنی ہے (اصول ومبادی میزان ۲۵)

جبکہ دوسری جگہ فرما رہے ہیں: ان کے بارے میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال اگر پیدا ہو جائے کہ ان کے الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں ہے تو ان میں سے ہر چیز بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گی (اصول ومبادی میزان ۳۳، ۳۴)

ایک جگہ قرآن کے بارے میں کہہ رہے ہیں ''ہر شخص پابند ہے کہ اس پر کسی چیز کو مقدم نہ ٹھہرائے'' (ایضاً ۲۳)

جبکہ دوسری طرف رقمطراز ہیں ''دوم یہ کہ سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدم ہے (ایضاً ۵۱)

''ہم تو ڈوبے صنم ساتھ
تم کو بھی لے کر ڈوبے''

لہٰذا غامدی صاحب کی جوتی انہیں کے سر پر پڑی غامدی صاحب کی زبان سے غامدی صاحب خود مطعون ومجروح ٹھہرے پس غامدی صاحب کی بات ناقابل قبول ہے انہی کی جرح کردہ بات ہے۔

تنبیہ: غامدی صاحب کو بہت بڑی غلط فہمی لگی ہے کہ سبعہ احرف (سات لہجے) والی حدیث صرف ابن شہابؒ کے واسطے سے آئی ہے حالانکہ ابن شہابؒ کے علاوہ دیگر رواۃ سے بھی یہ حدیث مروی ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے (سنن بیہقی جلد ۲ ص ۵۳۷، اور التمہید جلد ۳، ص ۶۳۵، مسند احمد، ج ۲، حدیث ۸۳۷۲)

ان روایات کی تمام اسانید صحیح ہیں۔ اور محمد ابن شہاب الزہریؒ کے علاوہ دیگر رواۃ سے منقول ہیں۔

غامدی صاحب اور دین فطرت

اصول غامدی:۔

غامدی صاحب نے جو دین اسلام میں ماخذ اختیار کئے ہیں وہ ماخذ اسلاف امت صحابہ کرام تابعین کے منہج سے بالکل علیحدہ ہیں.

غامدی صاحب اپنے خود ساختہ نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ چناچہ قرآن

کی دعوت اس کے پیش نظر جن مقامات سے شروع ہوتی ہے وہ یہ ہے (۱) دین فطرت (۲) سنت ابراھیمی (۳) نبیوں کے صحائف۔

پہلی چیز کا تعلق ایمان واخلاق کے بنیادی حقائق سے ہے اور اس کے ایک بڑے حصے کو وہ اپنی اصطلاح میں معروف ومنکر سے تعبیر کرتا ہے یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جن سے فطرت ابا کرتی ہے اور انہیں برا سمجھتی ہے قرآن ان کی کوئی جامع ومانع فہرست پیش نہیں کرتا بلکہ اس حقیقت کو مان کر کہ انسان ابتدا ہی سے معروف ومنکر دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہچانتا ہے اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کو اپنائے اور منکر کو چھوڑ دے **"والمومنون والمومنات بعض اولیاء بعض یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر"** (التوبہ ۷۱،۷۹) اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں یہ باہم دیگر معروف کی نصیحت کرتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ (اصول ومبادی میزان ص ۴۸،۴۹)

جواب:

اس میں کوئی شک نہیں کہ دین اسلام ایک فطری دین ہے۔ لیکن کیا چیز فطری ہے اور کیا غیر فطری اس کی رہنمائی انسان کی اپنی فطرت انفرادی طور پر نہیں کر سکتی۔ بلکہ اس کی صحیح رہنمائی دین اسلام (قرآن وسنت) کرتا ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ معروف ومنکر وہ چیز ہے جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہے اور وہ جنہیں فطرت برا سمجھتی ہے لیکن معروف ومنکر کی پہچان کروانا یہ شریعت کا کام ہے اور اگر ہم معروف ومنکر کی تعریف پڑھیں تو اور واضح ہو جاتی ہے۔

ابن اثیر فرماتے ہیں: معروف ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کو شریعت نے پسند کیا (یعنی اس چیز کی مدح کی ہو) (النھایۃ فی غریب الحدیث جلد ۳ ص ۱۹۷) اور اسی طرح ابن اثیر منکر کے بارے میں لکھتے ہیں: منکر ہر اس چیز کا نام ہے جس کو شریعت نے برا جانا ہو (یعنی اس کی مذمت کی ہو) یا اس کی حرمت یا کراہیت بیان کی ہو۔ (النھایۃ فی غریب الحدیث جلد ۵ ص ۱۰۰)

لہٰذا اچھی اور بری بات کی معرفت انسان کی اپنی فطرت سے نہیں بلکہ شریعت سے ہوتی ہے اور انسان کی فطرت شریعت کا کوئی حصہ نہیں بلکہ یہ شریعت پر عمل پیرا ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔

اگر کوئی کہے کہ ہر معروف ومنکر کی پہچان شریعت نے نہیں کروائی تو اس کی یہ بات قرآن کے خلاف ہے کیونکہ اس کی اس بات سے نعوذ باللہ دین نامکمل ہو کر رہ جاتا ہے جبکہ قرآن کہتا ہے **"الیوم اکملت لکم دینکم"** (المائدہ آیت ۳) ہم نے آج تمہارے لئے تمہارے دین (اسلام) کو مکمل کر دیا۔ اور اس سے پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ مومنوں کی صفات قرآن میں بیان ہوئی ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں تو کیا نعوذ باللہ مومنین قرآن وسنت کے علاوہ کسی اور چیز کا حکم دیتے ہیں۔

اور اگر اچھی بری بات کا علم انسان کو اس کی فطرت سے ہو جاتا تو پھر مومنین کو اچھی بات بتانے کی اور بری بات سے آگاہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر فطرت والی آیت یعنی سورہ الروم کی آیت نمبر ۳۰ کو غور وفکر کی نظر سے دیکھیں تو بات اور عیاں ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے۔ **"فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا"** "اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے" یہاں فطرت کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے یعنی یوں کہا کہ اللہ کی فطرت "تو اللہ کی فطرت کو اللہ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا ہم خود فطرت اللہ کو نہیں جان سکتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس فطرت کے بارے میں بتلایا ہے لہٰذا جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اور اپنے رسول کے ذریعے ان کے فرمان میں بیان فرما دیا ہے یہی دین فطرت ہے لہٰذا جو چیز شریعت بیان کرے وہ فطرت ہے نہ جو فطرت بیان کرے وہ شریعت ہے نبی ﷺ نے فرمایا: ہر بچہ

فطرت پر پیدا ہوتا ہے (صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورہ الروم) ہر بچہ فطرت پر پیدا ہونے کے باوجود اچھی اور بری چیز کی سمجھ نہیں رکھتا بلکہ اس کے بڑے اس کی اس بارے میں رہنمائی کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ فطرت اسلام ہے اور اسلام قرآن وسنت کو کہتے ہیں۔ لہٰذا رہنمائی کا اصل مأخذ قرآن وسنت ہے نہ کہ فطرت انسانی ہے۔

غامدی صاحب اپنا خود ساختہ اصول بناتے ہوئے (جس کو یہ فطرت کا نام دیتے ہیں) فرماتے ہیں کہ چیتے شیر گدھے اور کتے یہ ایسے جانور ہیں کہ ان کی حرمت کو اللہ نے قرآن میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ ان کی حرمت کا پتہ انسانی فطرت سے چل جاتا ہے۔

اگر ہم ان کے اس اصول کو غور سے دیکھیں تو ہمیں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں اور چند سوالات ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں.

۱) اگر حرام وحلال کی معرفت فطرت انسانیت سے ہوتی تو رسولوں کی بعثت اور کتابوں کے نزول کی کیا ضرورت تھی۔

۲) قرآن میں جن چیزوں کی حرمت کی وضاحت ہے کیا یہ غیر فطری ہیں اگر نہیں تو ان کی وضاحت کیوں کی گئی ان کو فطرت پر کیوں نہیں چھوڑا گیا۔

مثلاً قرآن نے مردار کو حرام قرار دیا ہے اور انسانی فطرت بھی اسے غلط سمجھتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عام انسان کی فطرت بھی اسے غلط تسلیم کر رہی ہے تو اللہ ربّ العالمین نے اسے واضح نام دے کر کیوں حرام کیا؟ اس کا مطلب یہی ہے کہ حلت وحرمت میں فطرت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

اسی طرح دم مسفوح شریعت نے اس کی حرمت کا نصاً ذکر کیا ہے انسانی فطرت پر نہیں چھوڑا ہے۔ حالانکہ دم مسفوح (بہتا ہوا خون) کو عام انسانی فطرت انتہائی ناپسندیدہ تصور کرتی ہے

الغرض شریعت کی تحریم وتحلیل میں فطرت کو کوئی اختیار نہیں۔

دراصل غامدی صاحب نے فطرت کا فرسودہ اصول بنا کر ان احادیث کا رد کیا ہے کہ جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے کسی بھی چیز کی حلت اور حرمت کے اصول بیان کئے ہیں۔ مثلاً پالتو گدھے کا حرام ہونا، گھوڑے کا حلال ہونا کچلی والے جانوروں کا حرام ہونا، اسی طرح نوک دار پنجے والے پرندوں کا حرام ہونا وغیرہ۔

غامدی صاحب نے اصول فطرت کے ذریعہ ان تمام احادیث کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے۔

اب اس اصول فطرت کا مطلب یہ ہوا کہ طوطا جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے اگر انسانی فطرت چاہے تو اس کو روسٹ کر کے تناول کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی درندہ مثلاً کتا یا بھیڑیا وغیرہ جو شریعت کے روح سے حرام ہے انسانی فطرت (غامدی فطرت) کی چاہت سے حلال ہو سکتا ہے **"نعوذبالله من ذالك"**۔

۳) اگر اچھی بری چیز کا پتہ فطرت سے ہو جاتا ہے تو غامدی صاحب کو اپنے استاد امین حسن اصلاحی کی شاگردی یا ان سے استفادہ کرنے کی کیا ضرورت پڑی۔

آگے غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ وہ جانور جس کی حلت وحرمت کا فیصلہ تنہا عقل وفطرت کی رہنمائی میں کر لینا انسان کے لئے ناممکن تھا ان کی حرمت کی وضاحت کر دی گئی۔ کیا خنزیر عقلی دلیل یا فطری دلیل سے حرام نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نبی اکرم ﷺ کی اس طرح صفت بیان کی ہے **(ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث)** (الاعراف آیت ۱۵۶) خبیث چیز کی حرمت کا فطرتی طور پر پتہ چل جاتا ہے۔ تو اس چیز کی حلت وحرمت نبی اکرم

ﷺ کی طرف کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔

۴)اگر قرآن پاک کی تخصیص رسول اللہ ﷺ کے فرامین (احادیث) سے نہیں کی جاسکتی تو اللہ نے اس طرح کیوں نہیں کہا کہ قرآن پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور خبیث چیزیں حرام کرتا ہے اور یوں کیوں کہا کہ نبی اکرم ﷺ ان کے لئے پاک چیزیں حلال کرتے ہیں اور خبیث چیزیں حرام کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کے لئے حلال کیں پاکیزہ چیزیں اور خبیث چیزیں ان کے لئے حرام کیں یعنی حلال وحرام کی نسبت نبی اکرم ﷺ کی طرف کی نہ کہ قرآن کی طرف جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے ہر صاحب عقل (عقل سلیم کے لئے) کہ نبی ﷺ کی حیثیت صرف ایک post man کی نہ تھی بلکہ وہ مکمل طور پر نبی اور اسوۃ بنا کر بھیجے گئے۔

غامدی صاحب اور آسمانی صحائف

اصول غامدی:۔

غامدی صاحب آسمانی صحائف (یعنی پچھلی کتابیں تورات انجیل وغیرہ) سے متعلق اپنا جو نظریہ بیان کررہے ہیں بالکل قرآن وسنت کے خلاف ہے اور غامدی بات کرتے ہیں امت کے تواتر اور اجماع کی جبکہ یہ نظریہ اس کے بھی خلاف ہے۔

غامدی صاحب کی عادت ہے کہ وہ ہر چیز کو مانتے تو ہیں مگر اس وقت تک مانتے ہیں کہ جب تک وہ چیز ان کے نظریہ کے مطابق ہو اور اگر ان کے نظریہ کے مطابق نہ ہو تو اسے نہیں مانتے ۔غامدی صاحب گذشتہ انبیاء پر نازل شدہ صحائف کو بھی شریعت محمدیہ کا حصہ مانتے ہیں جیسا کہ رقمطراز ہیں ''تیسری چیز وہ صحیفے ہیں جو اس وقت تورات زبور اور انجیل کی صورت میں بائیبل کے مجموعہ صحائف میں موجود ہیں ان کے بدقسمت حاملین نے ان کا ایک حصہ اگر چہ ضائع کردیا ہے اور ان میں بہت کچھ تحریفات بھی کردی ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ حکمت اور شریعت کا بڑا خزانہ اللہ تعالیٰ کے خاص اسالیب بیان میں۔اب بھی ان میں دیکھا جاسکتا ہے

(اصول ومبادی میزان،ص ۵۰)

جواب:۔

غامدی صاحب یہ بات تسلیم کررہے ہیں کہ موجودہ بائبل تحریف شدہ ہے اور یہ بالکل حقیقت ہے۔مثال کے طور پر ہم بائبل سے کچھ اقتباسات نقل کئے دیتے ہیں:

''اور لوطؑ صغر سے نکل کر پہاڑ پر جابسا اور اس کی دو بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں کیونکہ اسے صغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے تب پہلوٹی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے،آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں سوانہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔سولوطؑ کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔

(بائبل،کتاب پیدائش،باب نمبر۱۹،آیت ۳۰۔۳۶)

اسی طرح بائبل کے بیان کے مطابق ہارونؑ نے بچھڑا بنا کر بنی اسرائیل سے اس کی عبادت کروائی۔(بائبل،کتاب خروج،باب نمبر۳۲،آیت نمبر۴،۶)

قارئین کرام!یہ ہیں بائبل کے کچھ اقتباسات جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں بائبل میں اسی طرح کی ان گنت تحریفات اور تغیرات موجود ہیں۔مثلاً آپ کتاب غزل الغزلات کا مطالعہ کریں تو آپ پر مزید اس طرح کے انکشافات ہونگے۔حیرت کی بات ہے کہ غامدی صاحب کو اس محرف کلام میں حکمت اور شریعت کا بڑا خزانہ نظر آتا ہے۔

اس کلام (بائبل) کی اپنی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا ہر نیا ایڈیشن گذشتہ ایڈیشن سے مختلف ہوتا ہے۔

غامدی صاحب کو حدیث رسول میں تو رکاکت اور نا اسلوبی محسوس ہوتی ہے مگر اس محرّف کلام میں اللہ تعالیٰ کے خاص اسالیب بیان بڑی شدّ ومدّ سے نظر آتے ہیں

آخر غامدی صاحب کے علم میں یہ بات کیسے آئی کہ موجودہ بائبل میں ابھی بھی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت وحکمت کا بڑا خزانہ موجود ہے؟؟

اس کا معقول جواب یہ ہوسکتا ہے کچھ باتیں ایسی ہیں قرآن وسنت میں موجود ہیں اوران کا ذکر بائبل میں بھی ملتا ہے یعنی بائبل میں جو چیزیں قرآن وسنت کے مطابق ہیں انہیں اللہ کی شریعت کہا جاتا ہے بلکہ ان کے شریعت ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں لیکن ان کا اصل مآخذ قرآن وسنت ہی ہے۔آسمانی صحائف کے حوالے صرف ان کی تائید یا کسی غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دینے میں پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن آسمانی صحائف کو مستقل طور پر دلیل ماننا جہالت اور دین اسلام سے انحراف ہے۔

رہی بات غامدی صاحب کی پیش کردہ آیت کہ جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"وانزلنا الیك الکتاب بالحق مصدقالما بین یدیه من الکتاب ومهیمنا علیه فاحکم بینهم بماانزل الله"

ترجمہ: اور ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ یہ کتاب نازل فرمائی جو اپنے سے اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اوران کی محافظ ہے پس ان کے درمیان اس چیز سے فیصلہ کیجئے جو اللہ نے (آپ کی طرف) نازل فرمائی ہے۔(سورہ مائدہ آیت ۴۸)

یہاں قرآن مجید کے متعلق دو باتیں کہی گئی ہیں

(۱) تصدیق کرنے والی

(۲) محافظ

اوّل ذکر سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید مکمل موجودہ صحائف کی تصدیق نہیں کرتا بلکہ اسی کلام کی تصدیق کرتا ہے کہ جن آیات میں کلام الٰہی موجود ہے۔مرورِ زمانہ کے ساتھ بائبل کی اصل آیات بھی بالکل ناپیت ہو کر رہ گئی ہے۔ان آیات تک رسائی کا اصل مرجع اور ماخذ صرف قرآن وحدیث ہی رہ گئے ہیں۔

اور رہی بات کہ قرآن (مُھیمن) "محافظ، امین، شاہد، اور حاکم" بھی ہے یعنی پچھلی کتابوں میں کیونکہ تحریف وتغیر بھی ہوئی ہے اس لئے اس شریعت (قرآن وسنت) کا فیصلہ ناطق ہوگا جس کو یہ صحیح قرار دے گی وہی صحیح ہے باقی باطل ہے۔اور یہی "مُھیمن" کے اصل معنی ہیں اسی وجہ سے اللہ رب العزت اپنے پیارے نبی ﷺ کو اسی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا فرمایا: **فاحکم بینهم بماانزل الله**"۔پس آپ ان کے درمیان اسی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں جو منجانب اللہ (آپ کی طرف) نازل کردہ ہے۔

اور حق وہی ہے جو نبی ﷺ پر نازل ہوا "**بمانزل علی محمد وهوالحق من ربهم**" اور وہ لوگ اسی پر ایمان رکھتے ہیں جو محمد ﷺ پر نازل ہوا ہے وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔(سورہ محمد آیت ۲)

اور اس حق کو چھوڑ کر کسی اور چیز کو دلیل اور حجت تسلیم کرنا گمراہی ہے "**فماذا بعدالحق الاالضلال**"، اور حق کے بعد کیا رہ گیا ہے بجز گمراہی کے۔(سورہ یونس آیت ۳۳)

اصول غامدی:۔

آگے غامدی صاحب نے اپنے شاذ نظریہ کو پیش کیا ہے رقمطراز ہیں: سوم یہ کہ الہامی لٹریچر کے خاص اسالیب یہود ونصاریٰ کی تاریخ ،انبیاء بنی اسرائیل سرگزشتوں اوراس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب واشارات کو سمجھنے اوراس کے اجمال کی تفصیل کے لئے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے (اصول ومبادی میزان،ص۵۲)

جواب:۔

یہ بات بھی قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ’’**وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم**‘‘ اورہم نے تمہاری طرف ذکر کونازل کیا تاکہ تم اسکی (تفصیل) بیان کروجوان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔

یہ آیت صراحت کررہی ہے کہ قرآن کریم کے اسالیب واشارات اوراسکے اجمال کی تفصیل اللہ نے اپنے نبی ﷺ کے ذریعے بیان کی ہے(جوذخیرہ احادیث میں موجود ہے) نہ کہ قدیم صحیفوں کے ذریعے۔لہٰذا قرآن کریم اشارات واسالیب کو سمجھنے اوراس کے اجمال کی تفصیل کا اصل ماخذ نبی ﷺ کے فرامین ہیں ’’**ویعلمھم الکتاب والحکمۃ**‘‘ (سورہ ال عمران آیت۱۶۴)اور نبی ﷺ ان کو کتاب سکھاتے ہیں۔یعنی اس کی تعلیم دیتے ہیں اس تعلیم میں قرآن پڑھنااوراس کے اسالیب واشارات کا سمجھنااوراسکے اجمال کی تفصیل سب شامل ہیں۔لیکن غامدی صاحب بغیر دلیل کے کہہ رہے ہیں کہ قرآن کی تفصیل کا اصل ماخذ قدیم صحیفے ہیں حالانکہ قرآن کا نزول ان آسمانی صحائف کے بعد ہوالیکن غامدی صاحب عقل سلیم وفطرت کے خلاف بات کررہے ہیں کہ کتاب کی شرح پہلے نازل ہوگئی اورکتاب بعد میں نازل ہوئی۔

حالانکہ اصول تو یہ ہے کہ پہلے کتاب لکھی جاتی ہے پھر اسکے بعد اسکی شرح کی جاتی ہے جب کتاب ہی نہیں ہوگی تو شرح کیسے ہوگی بھلا غامدی صاحب یہ بات کیسے معقول ہوسکتی ہے؟؟

غامدی صاحب احادیث کوظنی کہہ کررد کردیتے ہیں حالانکہ احادیث کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اٹھائی ہے(دیکھئے سورہ حجر آیت۹اورسورہ الطلاق آیت۱۰)

لیکن ان صحائف کو مان رہے ہیں جن کی حفاظت اللہ نے نہیں اٹھائی اوران میں تحریف واقع ہوگئی اورمعلوم نہیں ان میں حق کیا اورباطل کیا ہے صرف قرآن وسنت ہی ہے جو پورا کا پورا حق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہی اسے حق کہا ہے۔اور جو چار انجیلیں ہیں وہ چار مختلف مؤلف حضرات نے لکھی ہیں۔

غامدی صاحب کا مبادی تدبر سنت

اصول غامدی:۔

غامدی صاحب سنت کو مانتے تو ہیں لیکن وہ سنت جوانکے اپنے نظریہ اوراصول کے مطابق ہو اس لئے انہوں نے سنت ماننے کے لئے کچھ اصول پیش کئے ہیں وہ رقمطراز ہیں: پہلا اصول یہ ہے کہ سنت صرف وہی چیز ہوسکتی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دین ہو قرآن اس معاملہ میں بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ اس کا دین پہنچانے ہی کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔

(اصول ومبادی میزان۶۳)

اسی اصول کو بیان کرتے ہوئے آگے فرماتے ہیں’’چنانچہ معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ میں تیروتلوار اوراس طرح کے دوسرے اسلحہ استعمال کئے ہیں اونٹوں پرسفر کیا ہے مسجد بنائی ہے تو اس کی چھت کھجور کے تنوں سے پاٹی ہے آگے غامدی صاحب اسی طرح چند مثالیں ذکر کرکے فرمارہے ہیں ان میں کوئی بھی چیز سنت نہیں۔(اصول ومبادی میزان۶۴)

جواب:۔

غامدی صاحب اگر یہ اصول وضع کرنے سے پہلے قرآن کریم کا مطالعہ کر لیتے تو شاید سنت کی صحیح تعریف سمجھ میں آ جاتی۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے"**لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃلمن کان یرجواللہ والیوم الاخر**"(سورہ احزاب آیت ۲۱)

ترجمہ: یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ میں عمدہ نمونے (موجود) ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی اور قیامت کی توقع رکھتا ہے۔

امام قرطبیؒ اپنی تفسیر میں "اسوہ" کے معنی سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"**الاسوۃ القدوۃوالاسوۃ مایتأسی بہ ای یتعزی بہ فیقتدی بہ فی جمیع افعال ویتعزی بہ فی جمیع احوال (تفسیر القرطبی جلد ۷ صفحہ ۱۱۵)**

امام قرطبی کی اس بات کا خلاصہ یہ ہے،اسوہ یہ ہے کہ تمام افعال واحوال میں نبی ﷺ کی پیروی کی جائے۔یہ آیت اس بات کی وضاحت کررہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام اقوال وافعال سنت ہیں جہاں تک بات رہی بخاری ومسلم کی اس حدیث کی جو غامدی صاحب نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہے اس میں اگر صحیح طور پر غور کیا جائے تو بات عیاں ہوتی ہے کہ نبی ﷺ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا"میں بھی ایک انسان ہی ہوں جب میں تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے لے لو اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میری حیثیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ میں ایک انسان ہوں میں نے اندازے سے ایک بات کہی تھی تم اسطرح کی باتوں پر مجھے جواب دہ نہ ٹھہراؤ جو گمان اور رائے پر مبنی ہو ہاں جب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ کہوں تو اسے لے لو اس لئے کہ میں اللہ پر کبھی جھوٹ نہ باندھوں گا تم اپنے دنیوی معاملات کو بہتر جانتے ہو(مسلم ۲۲۶۳،۲۳۶۱،۳۴۶۲،بحوالہ اصول ومبادی میزان ۶۴)

یہاں پر نبی ﷺ نے تابیر نخل کے معاملہ میں ایک مشورہ دیا تھا جو تابیر نخل کے معاملے میں صحیح نہیں ثابت ہوا۔

تو اس سے صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کی جو آیت ہم نے پیش کی ہے اس میں نبی ﷺ کے ہر عمل کی پیروی کا حکم ہے اور حدیث میں اس بات کی وضاحت ہے کہ سوائے وہ عمل جس کی وضاحت نبی ﷺ خود کر دیں کہ یہ میری ذاتی رائے ہے یا مشورہ ہے جیسا کہ اس تابیر نخل کے اس واقعہ میں آپ نے وضاحت کر دی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں مسلمانوں کو حکم دے رہا ہے "**وما اتکم الرسول فخذو ومانھاکم عنہ فانتھوا**"(الحشر آیت ۷)

جو کچھ رسول اللہ ﷺ تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے وہ منع کریں اس سے باز آجاؤ۔

اللہ تعالیٰ کا یہ حکم عام ہے لیکن غامدی صاحب نے اسکو نظر انداز کر دیا کیونکہ غامدی صاحب جو حکم دوسروں کو دیتے ہیں اس پر خود عمل نہیں کرتے دوسروں کو تو غامدی صاحب اس بات کی ترغیب دلا رہے ہیں کہ وہ قرآن کو سمجھتے سمجھاتے اور اس کی کسی آیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے وقت کم از کم تفسیر کی امہات کتب پر نظر ضرور ڈالیں ان امہات التفاسیر میں غامدی صاحب نے تین تفاسیر کا ذکر کیا ہے (۱) ابن جریر کی تفسیر (۲) رازی کی تفسیر (۳) اور زمخشری کی "الکشاف"۔

لیکن بذات خود غامدی صاحب نے اپنی رائے قائم کرنے سے پہلے ان تفاسیر پر نظر نہ ڈالی زمخشری "**وما اتکم الرسول فخذووما نھاکم عنہ فانتھوا**" کی تفسیر میں لکھتے ہیں "**والاجودان یکون عاما فی کل ما اتی الرسول ﷺ ونھی عنہ**" (الکشاف، ج ۴، ص ۵۰۷)

سب سے اچھی بات یہ کہ اللہ کا یہ حکم (بغیر کسی تخصیص کے) عام ہے اس چیز میں جو رسول اللہ

ﷺ دیں اور ہر اس چیز میں جس سے رسول اللہ ﷺ منع کریں۔اگر غامدی صاحب اپنے قول کے مطابق ''الکشاف'' کو پڑھ لیتے تو بات صحیح سمجھ میں آجاتی اور اس آیت کی مخالفت سے بھی بچ جاتے **(لم تقولون مالا تفعلون)** کہ تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے (الصّف۔آیت۲)

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ کا یہ حکم ''**وما اتكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا**'' جب عام ہے تو غامدی صاحب اس کی تخصیص حدیث سے کیوں کر رہے ہیں۔جبکہ غامدی صاحب کے نظریہ کے مطابق حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی تخصیص نہیں ہوسکتی لہٰذا یہاں پر بھی غامدی صاحب اپنے ہی اقوال کی مخالفت کررہے ہیں آخر کیا وجہ ہے کہ غامدی صاحب خود ہی قانون بناتے ہیں اور پھر خود ہی اس کی مخالفت کرتے ہیں؟ اور ایسے شخص کی بات کو کیسے مانا جائے کہ جو اپنے خود ساختہ اصول قائم کر کے پھر خود ہی ان کے خلاف عمل کرتا ہے۔

اصول غامدی:۔

غامدی صاحب نے سنت کے تدبر میں سات اصول بیان کئے ہیں یہ ان کے پہلے اصول کا جائزہ ہے وہ اپنے اصول کی مزید توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''دوسرا اصول یہ ہے کہ سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں علم وعقیدہ تاریخ شان نزول اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے سنت کا کوئی تعلق نہیں۔

غامدی صاحب تیسرے اصول میں رقمطراز ہیں: تیسرا اصول یہ کہ عملی نوعیت کی وہ چیزیں بھی سنت نہیں ہوسکتیں جن کی ابتداء پیغمبر کے بجائے قرآن سے ہوتی ہے۔

غامدی صاحب کا چوتھا اصول ہے کہ: سنت پر بطور تطوع عمل کرنے سے بھی وہ کوئی نئی سنت نہیں بن جاتی ہم جانتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس ارشاد خداوندی کے تحت کہ وہ **(ومن تطوع خيراً)** سورہ البقرہ آیت ۱۵۸) شب وروز کی پانچ لازمی نمازوں کے ساتھ نفل بھی پڑھی ہیں، اور رمضان کے روزوں کے علاوہ نفل روزے بھی رکھیں ہیں نفل قربانی بھی کی ہے لیکن ان میں کوئی چیز بھی اپنی اس حیثیت میں سنت نہیں ہے۔

غامدی صاحب کا پانچواں اصول یہ ہے کہ: وہ چیزیں جو محض بیان فطرت کے طور پر آئی ہیں وہ بھی سنت نہیں ہیں۔

غامدی صاحب کا چھٹا اصول یہ ہے کہ: وہ چیزیں بھی سنت نہیں ہوسکتیں جو نبی ﷺ نے لوگوں کی رہنمائی کے لئے انہیں بتائی تو ہیں لیکن اس رہنمائی کی نوعیت ہی پوری قطعیت کے ساتھ واضح کررہی ہے کہ انہیں سنت کے طور پر جاری کرنا آپ کے پیش نظر ہی نہیں اس کی ایک مثال نماز میں قعدے کے اذکار ہیں۔

غامدی صاحب کا ساتواں اصول یہ ہے کہ: جس طرح قرآن خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتا اسی طرح سنت بھی اس سے ثابت نہیں ہوتی۔(اصول ومبادی میزان ۶۵)

یہ وہ سنت کے سات اصول ہیں جنہیں غامدی صاحب سنت کے رہنما اصول کہتے ہیں غامدی صاحب نے رہنما اصول بغیر کسی دلیل کے پیش کئے ہیں ہم سب سے پہلے ان اصولوں کا جائزہ لیں گے اور پھر سنت کی اس تعریف کو بیان کریں جو محدثین وفقہاء نے بیان کی ہے غامدی صاحب کے پہلے اصول پر ہم نے تفصیلی بحث کی ہے۔

جواب:۔

غامدی صاحب کے دوسرے اصول کے مطابق علم وعقیدہ کا تعلق سنت سے نہیں ہے یہ ان کی کم علمی ہے گذشتہ آیتوں (یعنی سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۲۱ اور سورہ حشر کی آیت نمبر ۷) سے یہ

بات بالکل واضح ہے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے نبی ﷺ کی تمام تر زندگی کو اسوہ کہا ہے چاہے اس کا تعلق علم وعقیدے سے ہو یا عمل سے اسی طرح نبی ﷺ کے ہر حکم کو اخذ کرنے کا حکم دیا اور نبی کی ہر منع کردہ بات سے بچنے کا حکم دیا ہے اور اس میں علم وعقیدہ عمل سب شامل ہیں لہٰذا قرآن کریم کی رو سے یہ تمام امور سنت ہیں۔

چاہے وہ عمل جس کی ابتداء قرآن سے ہوتی ہو جیسا کہ غامدی صاحب کا تیسرا اصول ہے یا چاہے وہ نبی ﷺ نے بطور تطوع عمل کیا ہو جیسا کہ غامدی صاحب کا چوتھا اصول ہے یا وہ جو نبی ﷺ نے لوگوں کی رہنمائی کے لئے لوگوں کو بتایا۔ اگر ہم سنت کی صحیح تعریف کو پڑھیں تو ہمیں مزید وضاحت ملتی ہے ابن الاثیر فرماتے ہیں "**السنة وما يتصرف منها والاصل فيها الطريقة والسيرة واذأطلقت فى الشرع فانما يرادبها ماامربه النبى ﷺ ونهى عنه وندب اليه قولاوفعلاممالم ينطق به الكتاب العزيز**" (النهاية فى غريب الحديث جلد۲ص ۳۶۸)

سنت کے اصل معنی طریقے اور سیرت کے ہیں اور شریعت میں سنت کا اطلاق (ہر) اس چیز پر ہوتا ہے جس کو نبی ﷺ نے کرنے کا حکم دیا ہو یا جس چیز سے منع کیا ہو یا کوئی بھی بات کہی ہو یا کوئی بھی عمل کیا ہو جس کی وضاحت قرآن عزیز نہیں کرتا۔

اس تعریف سے غامدی صاحب کی یہ بات بھی غلط ثابت ہوتی ہے کہ سنت وہ بھی نہیں جن کی ابتداء قرآن سے ہوئی ہو جیسا کہ

آپ نے چوروں کے ہاتھ کاٹے ہیں زانیوں کو کوڑے مارے ہیں اوباشوں کو سنگسار کیا ہے وغیرہ وغیرہ غامدی صاحب کا کہنا ہے کہ اس میں سے کوئی بھی چیز سنت نہیں۔

غامدی صاحب چوروں کے ہاتھ کاٹنے اور زانیوں کو کوڑے مارنے کا حکم تو قرآن نے ہی دیا ہے لیکن ہاتھ کس طرح کاٹے جائیں کتنے کاٹے جائیں کتنی چوری پر کاٹے جائیں دونوں ہاتھ کاٹے جائیں یا ایک ہاتھ کاٹا جائے یہ سب تفصیل ہمیں رسول اللہ ﷺ کے فرامین سے ہی معلوم ہوتی ہے اور پھر یہ تمام چیزیں سنت ہی کہلائیں گی جیسا کہ بیان کردہ سنت کی تعریف میں وضاحت ہوئی ہے۔

غامدی صاحب نے یہاں پر اوباشوں کی سنگساری کو قرآن کا حکم کہے رہے ہیں میں غامدی صاحب سے پوچھتا ہوں یہ حکم قرآن مجید میں کہا ہے؟ غامدی صاحب ان احکامات کو قرآن کی تفہیم وتبیین اور اسوہ حسنہ سے تعبیر کر رہے ہیں لیکن نا جانے کیوں سنت کو ماننے کو تیار نہیں ہیں۔

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ دین ہم تک دو صورتوں میں پہنچا (۱) قرآن مجید، (۲) سنت، (اصول ومبادی میزان ۹)

جبکہ یہاں پر تیسری صورت کا اضافہ کر رہے ہیں جس سے وہ قرآن کی تفہیم وتبین اور اسوہ حسنہ کہہ رہے ہیں آخر غامدی صاحب اپنی کسی ایک رائے پر قائم کیوں نہیں رہتے؟

غامدی صاحب کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتوں گدھے کے گوشت کی ممانعت سے متعلق جو احکامات ہیں اس کو فطرت کا بیان کہہ رہے ہیں لیکن سنت ماننے سے انکار کر رہے ہیں آخر کونسی ایسی آیت ہے یا کونسی ایسی دلیل ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ ان چیزوں (پالتوں گدھے وغیرہ) کی ممانعت یا حرمت فطرت انسان کا بیان کردی حکم ہے؟؟

اور ہم دین فطرت سے متعلق مضمون میں واضح کر چکے ہیں کہ فطرت کی حیثیت دین میں مستقل دلیل کی نہیں بلکہ فطرت کا کام صرف اتنا ہے کہ انسان اس کے ذریعے اچھی یا بری چیز کی پہچان کر سکے نہ کہ کسی چیز پر شر وخیر یا حلال وحرام کا حکم لگائے۔

اور رہی بات یہ کہ جس طرح خبر واحد سے قرآن ثابت نہیں ہوتا اسی طرح سنت بھی اس سے ثابت نہیں ہوتی تو یہ غامدی صاحب کا قیاس ہے اور قیاس سے اصول نہیں بنائے جاتے اور دوسری

بات یہ ہے کہ یہ اصول قرآن کریم کے خلاف بھی ہے قرآن مجید میں اللہ تعالی نے انبیاء کی سنت کی ثبوت اتباع میں خبر واحد کو حجت ودلیل کے طور پر پیش کیا ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ''**وجاء من اقصا المدینة رجل یسعی قال یقوم اتبعوالمرسلین اتبعوا من لایسئلکم اجراوھم مھتدون**'' (سورہ یٰسین آیت ۲۰۔۲۱)''پرلے شہر کے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا کہا اس نے اے میری قوم رسولوں کی اتباع کرو ان کی اتباع کرو جو تم سے اجرت نہیں مانگتے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں''

یہاں پر اللہ رب العزت نے اس اکیلے شخص کی خبر کو اس قوم کے لئے تو حجت قاطع کے طور پر پیش کیا ہے جس نے اپنی قوم کو رسولوں کی سنت کا درس دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خبر واحد کو قرآن مجید میں حجت قرار دیتا ہے اور اپنے رسول کے عمل (سنت) کو انکی امت کے لئے دلیل و برھان کہتا ہے اگر چہ وہ خبر واحد سے ثابت ہو۔

اس کے علاوہ قرآن میں کئی آیتیں ہیں جن سے خبر واحد کی حجت ثابت ہوتی ہے۔

اب ہم سنت کی اس تعریف کو بیان کریں گے جو محدثین وفقھا اور اھل اصول کی جماعت نے بیان کی ہیں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

''**والمراد بالکتاب القرآن المتعبد بتلاوته بالسنة ماجاء عن النبی ﷺ من اقواله وافعاله وماھمّ بفعله**''سنت سے مراد نبی ﷺ کے افعال واقوال اور آپ کی تقریر یا جس فعل کا آپ نے ارادہ کیا ہو (لیکن اس پر عمل نہ کر پائے ہوں جیسے عاشورہ اس سے ایک دن پہلے یا بعد کا روزہ)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں یہ اھل اصول اور محدثین کی اصطلاح ہے (فتح الباری جلد۱۳ صفحہ ۳۰۶)

اگر ہم غامدی صاحب کے اصول سنت اور محدثین واھل اصول کی اس تعریف کو قرآن کریم کی روشنی میں دیکھیں تو حق بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ محدثین کی اصطلاح سنت قرآن کے مطابق اور غامدی صاحب کے اصول سنت قرآن کے خلاف یہاں تک انکے اپنے اصول کے خلاف نظر آئیں گے۔ مزید وضاحت انشاءاللہ ہم اپنے مضمون سنت اور حدیث کے فرق میں کریں گے۔

غامد صاحب کا مبادی تدبر حدیث

غامدی صاحب نے حدیث سے متعلق اپنے کچھ قواعد بیان کئے ہیں جس طرح انہوں نے سنت کے قواعد بیان کئے ہیں اسی طرح انہوں نے حدیث کو تسلیم کرنے یا اس کو دلیل ماننے کے لئے کچھ مبادی بیان کئے ہیں افسوس کی بات ہے کہ غامدی صاحب پچھلے آسمانی صحائف جو کہ تحریف شدہ اور منسوخ ہیں اور انکی حفاظت کی کوئی گارنٹی نہیں بغیر کسی اصول وقوانین اور بغیر کسی مبادی تدبر کے دین کا ماخذ تسلیم کررہے ہیں لیکن حدیث کو تسلیم کرنے کے لئے ایسے قواعد وضوابط وضع کررہے ہیں جس سے حدیث کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں شک وشبھات پیدا ہوجاتے ہیں اور حدیث ایک کھلونا بن کررہ جاتی ہے جس کے ذہن میں جو حدیث اتر جائے تو اس کو تسلیم کرلے جو نہیں اترے اسکا انکار کردے حالانکہ حدیث دین کا سب سے بڑا دوسرا ماخذ ہے اور اسکے محفوظ اور صحیح ہونے کی گارنٹی قرآن کریم میں موجود ہے۔

اصول غامدی:۔

اب ہم ان مبادی کا جائزہ لیتے ہیں جو غامدی صاحب نے حدیث سے متعلق بیان کئے ہیں :غامدی صاحب حدیث کے متن سے متعلق اپنا نظریہ اس طرح بیان کرتے ہیں ''سند کی تحقیق کے بعد دوسری چیز حدیث کا متن ہے راویوں کی سیرت وکردار اور انکے سوانح وحالات سے متعلق صحیح معلومات تک رسائی کے لئے اگر چہ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اس کام میں اپنی عمر کھپا دی ہیں لیکن ہر انسانی کام کی طرح حدیث کی روایت میں بھی فطری خلا اس کے باوجود باقی رہ گئے ہیں

ان کے پیش نظر یہ دو باتیں اس متن میں بھی لازماً دیکھنی چاہئیں۔

ایک یہ کہ اس میں کوئی چیز قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو دوسری یہ علم وعقل کے مسلمات کے خلاف نہ ہو۔(اصول ومبادی۔۶۹)

جواب:۔

ایک طرف تو غامدی صاحب سند کے بارے میں محدثین کے معیار کو قطعی کہہ رہے ہیں اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جاسکتی (ایضاً) اور پھر بیان فرمارہے ہیں کہ ہر انسانی کام کی طرح حدیث کی روایت میں بھی فطری خلا اس کے باوجود باقی رہ گئے ہیں۔

غامدی صاحب بات سمجھانے کے بجائے اسکو الجھا رہے ہیں۔متن ہو یا سند دونوں کا معیار محدثین نے ایسا بنایا ہے کہ جس میں کوئی کمی اور زیادتی نہیں کی جاسکتی اور اسی معیار کو سامنے رکھ کر ہر حدیث کو جانچا جاسکتا ہے مزید تفصیل انشاءاللہ آگے آئے گی۔

اور حدیث کا قرآن وسنت اور علم وعقل کے خلاف ہونے سے متعلق خود غامدی صاحب نے گفتگو کی ہے تو کبھی صحیح حدیث چاہے خبر واحد ہو یا متواتر قرآن وسنت اور علم وعقل کے مسلمات کے خلاف ہوتی ہی نہیں اگر کوئی حدیث قرآن وسنت اور علم وعقل کے خلاف ہوتی ہے تو اسکی وضاحت محدثین نے کی ہے اور اس سے متعلق جو علت متن وسند میں ہوتی ہے اسکی وضاحت کی ہے لیکن اسکا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کسی بھی صحیح حدیث کو قرآن وسنت پر پیش کیا جائے یا علم وعقل پر پیش کیا جائے اگر مطابقت ہو تو مان لیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے مزید تفصیلات انشاءاللہ آگے آئیں گی۔

دلیل غامدی:۔

آگے غامدی صاحب نے اپنی بات کی تائید میں ''الکفایہ فی علم الروایہ کے حوالے سے خطیب بغدادی کا قول نقل کیا ہے خطیب بغدادی لکھتے ہیں''**ولا یقبل خبر الواحد فی منافاۃ حکم العقل ،وحکم القرآن الثابت المحکم ،والسنۃ المعلومۃ والفعل الجاری مجری السنۃ وکل دلیل مقطوع بہ**'' (۴۳۲)خبر واحد اس صورت میں قبول نہیں کی جاتی جب عقل اپنا فیصلہ اس کے خلاف سنا دے وہ قرآن کے کسی ثابت اور محکم حکم کے خلاف ہو سنت معلومہ یا ایسے کسی عمل کے خلاف ہو جو سنت کی طرح معمول بہ ہو،کسی دلیل قطعی سے اس کی منافات بالکل واضح ہو جائے (اصول ومبادی میزان ۷۰)

جواب:۔

غامدی صاحب محدثین کے انہی اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں جو انکی فکر کے مطابق ہوں یہ اصول جو غامدی صاحب پیش کر رہے ہیں یہ خبر واحد سے متعلق ہے جبکہ غامدی صاحب نے اس اصول کے پیش نظر خبر متواتر کا بھی انکار کیا ہے جیسا کہ سبعہ احرف میں قرآن کے نزول والی روایت ابوعبیدہ فرماتے ہیں''**تواتر الاخبار بالاحرف السبعۃ**'' (البرہان للزرکشی جلد ۱ص ۲۱۲)

''نزول قرآن سے متعلق''احرف سبعہ والی روایت متواتر ہے لہٰذا سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خطیب بغدادی کا کلام غامدی صاحب کے موقف کی تائید نہیں کرتا کیونکہ اسکا تعلق خبر واحد کے ساتھ ہے اور غامدی صاحب کی سوچ خبر واحد اور متواتر دونوں کے بارے میں یہی ہے کہ جو انکی عقل یا انکی سوچ کے مطابق ہوگی وہ انکے نزدیک صحیح ہے اگر مطابق نہیں تو غلط ہے دوسری بات

یہ ہے کہ غامدی صاحب نے خطیب بغدادی کی پوری بات نقل نہیں کی صرف انکے کلام کے آخری حصے کو نقل کر دیا جب تک پوری بات نہ پڑھی جائے بات واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتی اور متکلم کی منشاء کا مفہوم عیاں نہیں ہوتا خطیب بغدادی نے خبر واحد کے قرآن وسنت اور عقل کے خلاف ہونے سے متعلق جواصول بتایا ہے اسی باب میں اسی صفحے میں اسکی علت بھی بیان کی ہے وہ فرماتے ہیں''**والعلة فی ذالك انه اذالم یعلم ان الخبر قول رسول الله ﷺ كان ابعد من العلم بمضمونه** '' (الکفایہ فی علم الروایہ ص ۳۷۱ ''اسی بات (یعنی خبر واحد قرآن وعقل کے خلاف) میں جوعلت ہے وہ یہ کہ جب یہ معلوم ہی نہ ہو پائے کہ خبر رسول اللہ ﷺ کی بات ہے تو علم کے مضمون سے بہت دور ہے''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطیب بغدادی اس خبر کی بات کر رہے ہیں جس کی صحت ثابت نہ ہو یعنی جس میں ضعف ہو وہ قرآن وسنت اور علم وعقل کے خلاف ہوتی ہے صحیح خبر کبھی بھی قرآن وسنت اور عقل کے خلاف نہیں ہوتی اس بات کی مزید وضاحت الکفایہ فی علم الروایہ کے اس باب سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے ''تعارض الاخبار'' کے نام سے تشکیل دیا ہے خطیب بغدادی اس میں محمد بن طیب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں''**کل خبرین علم ان النبی ﷺ تکلم بهما فلا یصح دخول التعارض فیهما** '' (الکفایہ فی علم الروایہ،ص ۳۷۱) جب یہ معلوم ہو جائے کہ دونوں حدیثیں نبی ﷺ سے ثابت ہیں (یعنی انکی صحت بالکل درست ہے) تو ان میں آپس میں تعارض ناممکن ہے۔اسی صفحے پر محمد بن طیب نے قرآن کے ساتھ تعارض کا بھی ذکر کیا ہے (ایضاً)

تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطیب بغدادی کا یہ نظریہ تھا کہ جس حدیث کی صحت ثابت ہو جائے چاہے وہ خبر واحد ہی کیوں نہ ہو کسی دوسری صحیح حدیث یا قرآن وعقل کے خلاف کبھی نہیں ہوسکتی۔

اگر غامدی صاحب ''الکفایہ'' کا صحیح طور پر مطالعہ کرتے تو خطیب بغدادی کے بیان کردہ اصول کو ٹھیک طریقے سے سمجھ سکتے تھے لیکن انہوں نے حسب عادت اپنے مطلب کی بات اخذ کرنے کی کوشش میں خطیب بغدادی کے دوسرے اصولوں کو نظر انداز کر دیا ہم مزید وضاحت کے لئے الکفایہ کے حوالے سے اسی عبارت کو نقل کر دیتے ہیں جسے خطیب بغدادی نے یحیٰی بن محمد کے حوالے سے نقل کیا ہے لکھتے ہیں''**یقول لایکتب الخبر عن النبی ﷺ یرویه ثقه عن ثقة حتیٰ یتناهی الخبر الی النبی ﷺ بهٰذه الصفة ولا یکون فیهم رجل مجهول ولارجل مجروح فاذاثبت الخبر عن النبی ﷺ بهٰذه الصفة وجب قبوله والعمل به وترك مخالفة**''
(الکفایہ فی علم الروایہ،ص ۳۴)

نبی ﷺ کی نسبت سے کوئی خبر جب تک لکھی یا مانی نہ جائے جب تک ثقہ راوی ثقہ سے روایت کرے اور سند اسی طرح نبی ﷺ تک پہنچ جائے نہ ان میں کوئی راوی مجہول اور نہ کوئی مجروح ہو پھر اگر اسی طریقے سے حدیث نبی ﷺ سے ثابت ہو جائے تو اسکو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا اور اسکی مخالفت کو ترک کرنا واجب ہو جاتا ہے (چاہے وہ خبر واحد ہو) اس عبارت سے ہماری بات کی تائید ہوتی ہے کہ جب کوئی صحیح حدیث آجائے تو اس پر عمل کرنا اور اسکو ماننا واجب ہو جاتا ہے چاہے وہ خبر واحد ہی کہ ذریعے کیوں نہ ہو اور وہ قرآن وسنت اور علم وعقل کے خلاف نہیں کیونکہ جس خبر پر عمل کرنا اور اسکا ماننا ضروری ہو وہ کبھی قرآن وسنت اور علم وعقل کے خلاف نہیں ہوتی۔

لہٰذا جب خطیب بغدادی ہر صحیح حدیث چاہے وہ خبر واحد ہو کے متعلق یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اسے قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے تو اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس خبر واحد کو وہ قرآن وسنت کے خلاف اور علم وعقل کے خلاف نا قابل قبول کہہ رہے ہیں وہ اس خبر واحد کے بارے میں کہہ رہے ہیں جس کی صحت درست نہ ہو تو ان کے کہنے کا اصل مطلب یہ ہوا۔کہ جس خبر کی صحت ثابت نہ ہو تو وہ قرآن وسنت اور علم وعقل کے خلاف ہوتی ہے۔

اگر کوئی کہے کہ خطیب بغدادی کا ارادہ یہاں ضعیف حدیث کے بارے میں تھا تو خبر واحد کا ذکر کیوں کیا متواتر کا کیوں نہ کیا یا مطلق طور پر حدیث کیوں نہیں کہا؟؟

تو اسکا جواب یہ ہے کہ متواتر کا حکم اس حدیث پر لگتا ہے جس کی صحت بالکل واضح ہوتی ہو اور متواتر کبھی ضعیف نہیں ہوتی اس لئے متواتر کا ذکر نہیں کیا اور خبر واحد کا ذکر اس وجہ سے کیا کہ ضعف ہمیشہ خبر واحد میں ہوتا ہے لیکن جس میں خبر واحد کی صحت ثابت ہو جائے تو وہ واجب العلم والعمل ہے۔اور وہ کبھی علم وعقل اور قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہوتی یہی خطیب بغدادی کا مقصد تھا۔

مبادی فہم حدیث:

اصول غامدی:۔

آگے غامدی صاحب مبادی تدبر حدیث کے مزید اصول بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :اس کے بعد اب فہم حدیث کے مبادی کو لیجئے۔(اصول مبادی میزان،ص ۷۱)

یہ فرما کر غامدی صاحب نے اس طرح باب باندھا ہے ''عربیت کا ذوق''اس باب میں غامدی صاحب لکھتے ہیں''پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن کی طرح حدیث کی زبان بھی عربی معلّٰی ہے اس میں شبہ نہیں کہ حدیث کی روایت زیادہ تر بالمعنی ہوئی ہے لیکن نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کی زبان اس کے باوجود اس میں اتنی محفوظ ضرور رہی ہے کہ اسے ایک صاحب ذوق بہت حد تک دوسری چیزوں سے الگ پہچان سکتا ہے قرآن کی طرح اس زبان کا بھی ایک خاص معیار ہے جو اپنے سے کم تر کسی چیز کا پیوند اپنے ساتھ گوارا نہیں کرتا چناچہ یہ ضروری ہے کہ حدیث کے طلبہ بار بار کے مطالعہ سے اس زبان کی ایسی مہارت اپنے اندر پیدا کرلیں کہ نہ ''**الشیخ والشیخة** ''جیسی چیزوں کو محض زبان ہی کی بنیاد پر رد کر دینے میں انہیں کوئی تردد ہو اور نہ ہی''البکر بالبکر''جیسے مشکل اسالیب کو سمجھنے میں وہ کوئی دقت محسوس کریں (اصول مبادی میزان،ص ۷۱)

جواب:۔

غامدی صاحب اصولوں کو اپنے ذہن کے مطابق ڈھال کر بیان کررہے ہیں اگر ہم محدثین کے اصول حدیث اور غامدی صاحب کے اصول حدیث کا موازنہ کریں تو کافی حد تک فرق واضح ہو جائے گا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حدیث کی عربی فصیح وبلیغ اور آپ ﷺ کے فرامین جامع اور فصیح وبلیغ ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یقینی ہے۔کسی صحیح حدیث میں اس قسم کی علت (یعنی عربی لغت کی فصاحت میں کمی یا الفاظ کی رکاکت یا خلاف قرآن وسنت وعقل) ہوتی ہی نہیں ہے۔

محدثین کے اصول کا مطالعہ اگر غور سے کیا جائے تو بات کی وضاحت ہو جاتی ہے اگر چہ محدثین نے یہ چیز بھی ملحوظ رکھی ہے کہ حدیث کے الفاظ کی فصاحت وبلاغت کو دیکھا جائے۔لیکن محدثین کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ کوئی بھی صحیح حدیث کی فصاحت وبلاغت کی کمی کو دیکھ کر یا اسے قرآن وسنت یا عقل کے خلاف محسوس کر کے رد کر دیا جائے بلکہ محدثین کا مطلب یہ تھا کہ موضوع (یعنی غیر صحیح گھڑی ہوئی) کی پہچان یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت اور عقل کے خلاف ہوتی ہے یا اس کی عربی میں فصاحت وبلاغت نہیں ہوتی نہ کہ محدثین کا یہ مقصد تھا کہ ہر صحیح حدیث کی عربیت کو چیک کر کے اور اسے قرآن وسنت کے خلاف کہہ کر رد کر دیا جائے۔

امام جلال الدین سیوطی نے موضوع حدیث کی بہت سی علامات ذکر کی ہیں جن میں سے یہ بھی ہے کہ وہ قرآن وسنت کے خلاف ہوتی ہیں یا عقل سلیم کے خلاف ہوتی ہے یا ان میں الفاظ کی رکاکت ہوتی ہے یعنی غیر صحیح وبلیغ الفاظ ہوتے ہیں دیکھئے (تدریب الراوی للسیوطی ص ۲۴۵،۲۴۶)

غامدی صاحب عربیت کے ذوق کے اصول کو ہر حدیث کے لئے وضع کر کے اپنے نظریہ کے خلاف حدیثوں کا رد کر رہے ہیں۔

حالانکہ محدثین نے عربیت کے ذوق کو یعنی اسکی فصاحت و بلاغت کو حدیث کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار نہیں ٹھہرایا بلکہ غلط حدیث کی پہچان بتائی ہے کہ اسکا ذوق عربیت اور اسکی فصاحت و بلاغت درست نہیں ہوتی۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ جب غامدی صاحب کے نزدیک روایت حدیث زیادہ تر بالمعنی ہوئی ہے تو اس اصول سے حدیث کو پرکھنے کا کیا فائدہ کیونکہ امام بلقینیؒ موضوع روایت کی علامات بتاتے ہوئے فرماتے ہیں **"أما رکاکة اللفظ فقط فلا تدل علی ذٰلك لاحتمال ان یکون رواہ بالمعنی فغیر الفاظه بغیر فصیح نعم ان صرح بانه من لفظ النبی ﷺ فکاذب "**(تدریب الراوی،ص ۲۴۷)

جہاں تک بات ہے الفاظ کی رکاکت کی تو یہ اس پر (یعنی حدیث کے موضوع ہونے پر) دلالت نہیں کرتی کیونکہ اس میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ روایت بالمعنی بھی ہوسکتی ہے (کہ راوی نے) الفاظ بیان کر کے انہیں غیر فصیح کر دیا ہو ہاں اگر اس بات کی صراحت کرے کہ یہ الفاظ نبی ﷺ کے ہیں تو وہ جھوٹا ہے (کیونکہ آپ ﷺ کے الفاظ فصیح ہوتے ہیں)

امام بلقینیؒ کے اس کلام سے غامدی صاحب کا مکمل طور پر رد ہوتا ہے۔

(۱) غامدی صاحب کے نزدیک حدیث زیادہ تر روایت بالمعنی ہوئی ہے۔

(۲) امام بلقینیؒ کی اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ محض الفاظ رکاکت (یعنی غیر فصاحت) سے حدیث موضوع غلط نہیں ہوجاتی اس احتمال کی وجہ سے کہ روایت بالمعنی بھی ہوسکتی ہے۔

(۳) الفاظ کی رکاکت اور غیر فصاحت کے باوجود اگر راوی اسے نبی ﷺ کے الفاظ کہے تو حدیث نہیں مانی جائے گی اور اگر وہ اس بات کی صراحت نہیں کرے تو حدیث اس احتمال کی وجہ سے قبول کر لی جائے گی کہ روایت بالمعنی ہوئی ہے۔

لہٰذا غامدی صاحب عربی کے غیر فصیح ہونے کی وجہ سے روایت نہیں رد کر سکتے کیونکہ کچھ پتہ نہیں کہ روایت بالمعنی بھی ہوسکتی ہے اور غامدی صاحب کے نزدیک روایت حدیث زیادہ تر بالمعنی ہوئی ہے غامدی صاحب نے اس مضمون سے متعلق جو مثال پیش کی ہے غامدی صاحب اسے غیر فصیح عربی کہہ رہے ہیں اور اسکا حدیث ہونے سے انکار کر رہے ہیں غامدی صاحب اپنے آپ کو اتنا بڑا اعربی دان سمجھ کر کہہ رہے ہیں کہ "الشیخ والشیخۃ" کو محض زبان کی بنیاد پر رد کر دیا جائے دراصل یہ روایت غامدی صاحب کے نظریہ کے خلاف ہے کیونکہ اس سے شادی شدہ زانیوں کے لئے رجم کی سزا مقرر ہوتی ہے اور غامدی صاحب رجم کی سزا کے قائل نہیں ہیں "الشیخ والشیخۃ" جیسے الفاظ کو غامدی صاحب غیر فصیح اور عربیت کے ذوق کے خلاف کہہ رہے ہیں غامدی صاحب اگر آپ قرآن کریم کا غور سے مطالعہ کریں اور اور عربی لغت کی کتابوں کا بھی غور سے مطالعہ کریں تو آپ کو صحیح معنی میں عربیت کے ذوق کا علم ہوگا۔ "الشیخ" یہ لفظ قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے مثال کے طور ارشاد ہوتا ہے: وابونا شیخ کبیر" (القصص،۲۸ آیت ۲۳) اس کے علاوہ بھی آیتیں ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اگر کوئی اس لفظ کو غیر فصیح کہتا ہے تو نعوذ باللہ اس کے نزدیک قرآن غیر فصیح ہے لفظ شیخ مذکر ہے "والشیخۃ" اسکا مؤنث ہے لغت کی سب سے بڑی کتاب لسان العرب میں ابن منظور فرماتے ہیں **"شیخ :الذی استبانت فیه السن وظهر علیه الشیب وقیل هو شیخ من خمس الی آخره والانثی شیخة"** (لسان العرب جلد ۷ ص ۲۵۴)

"الشیخ وہ ہے جس پر عمر کی زیادتی اور بڑھاپا واضح ہوجائے اور کہا جاتا ہے شیوخت کی عمر پچاس سال کے بعد شروع ہوتی ہے"۔

یہ لغت کے بہت بڑے امام کا بیان ہے ایک طرف لغت کے بڑے امام ہیں جو لفظ ''شیخۃ'' کو عربی کا ادبی اور فصیح وبلیغ لفظ کہہ رہے ہیں اور ایک طرف وہ شخص ہے جو عربی زبان سے صحیح طور پر واقف ہی نہیں ہے جس نے قرآن کی اس آیت ''**فانہ رجس** '' (الانعام آیت ۱۴۵) کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ''یہ سب ناپاک ہیں'' حالانکہ ''فانہ'' میں ضمیر مفرد ہے اور اس سے پہلے خنزیر کے گوشت کا ذکر اور ضمیر اسی کی طرف لوٹتی ہے اس کا ترجمہ اس طرح ہوگا کہ وہ (یعنی خنزیر کا گوشت) ناپاک ہے لیکن غامدی صاحب نے عربی زبان سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہوئے اس عبارت کا غلط ترجمہ کیا ہے۔

قارئین محترم! خود فیصلہ کریں کہ کس کی بات درست ہے ان کی جنہیں اللہ نے عربی لغت کا بے پناہ علم عطاء کیا اور ان کے علم کی بناء پر انہیں امام اللغۃ میں شمار کیا جانے لگا یا وہ جس کی عربی اتنی کمزور ہے کہ قرآن پاک کا ترجمہ بھی صحیح طرح نہیں کرسکتا۔

اور ابن منظور نے اس کے بعد شاہد کے طور پر یہ شعر بھی پیش کیا'' قال عبید بن الأبرص:

كانها لقوة طلوب
تيبس في وكرها القلوب
باتت على أرم عزوبا
كانها شيخة رقوب

(لسان العرب جلد ۷ ص ۲۵۴)

اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ لفظ ''شیخۃ'' ادبی اور فصیح لفظ ہے اور میرا خیال ہے کہ اب غامدی صاحب کو بھی اس لفظ کی فصاحت وبلاغت اور ادبیت اور اسکے ذوق عربیت کو تسلیم کرکے اس حدیث کو مان لینا چاہئے کیونکہ غامدی صاحب کے نزدیک یہ اشعار ہی قرآن مجید کے بعد زبان (لغت) کی تحقیق میں سند وحجت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غامدی صاحب لیجئے ہم نے آپ کے اصول سے الشیخ والشیخۃ (مؤطا امام مع شرح الزرقانی ج ۴ ص ۱۷۸ کتاب الحدود باب ماجاء فی الرجم) کی فصاحت وبلاغت اور اسکا حدیث ہونا ثابت کردیا۔

اصول غامدی:۔

آگے مزید حدیث کی فہم کے مبادی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''دوسری چیز یہ ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے دین میں قرآن کا جو مقام ہے وہ ہم اس سے پہلے بیان کرچکے ہیں۔ نبی ﷺ نے اپنی حیثیت نبوت ورسالت میں جو کچھ کیا اسکی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ بھی قرآن ہی ہے لہٰذا حدیث کے بیشتر مضامین کا تعلق اس سے وہی ہے جو کسی چیز کی فرع اس کی اصل سے اور شرح کا متن سے ہوتا ہے اصل اور متن کو دیکھے بغیر اس کی شرح اور فرع کو سمجھنا ظاہر ہے کہ کسی طرح ممکن نہیں ہوتا حدیث کو سمجھنے میں جو غلطیاں اب تک ہوئیں ہیں ان کا اگر وقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت صاف واضح ہوجاتی ہے۔عہد رسالت میں رجم کے واقعات کعب بن اشرف کا قتل عذاب قبر اور شفاعت کی روایتیں ''**امرت ان اقاتل الناس** اور **من بدل دینہ فاقتلوہ** '' جیسے احکام اس لئے الجھنوں کا باعث بن گئے کہ انہیں قرآن میں انکی اصل سے متعلق کرکے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی حدیث کے فہم میں اس اصول کو ملحوظ رکھا جائے تو اس کی بیشتر الجھنیں بالکل صاف ہوجاتی ہیں۔

(اصول ومبادی میزان، ص ۷۲۔۷۱)

جواب:۔

افسوس کی بات ہے کہ غامدی صاحب نے کم علمی کی حد کردی ہے بغیر سوچے سمجھے حدیث کو فروع کہہ رہے ہیں حالانکہ حدیث دین کا اصل ماخذ ہے یہاں غامدی صاحب فرمارہے ہیں کہ

متن کو دیکھے بغیر شرح سمجھنا ناممکن ہے یعنی متن کو پہلے دیکھا جائے گا پھر شرح کو اسکے تابع دیکھا جائے گا جبکہ متن کو شرح کی رو سے سمجھا جاتا ہے لیکن غامدی صاحب اپنی عادت کے مطابق الٹی بات کہہ رہے ہیں ۔حالانکہ خود غامدی صاحب نے شرح کی ہے اور پھر متن کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ قرأت کے اختلافات میں غامدی صاحب نے بیان کیا ہے کہ پہلے اپنی اسکیم کو تشکیل دیا ہے پھر اسکے مطابق قرآن کی آیات کا ترجمہ کیا ہے (دیکھئے ہمارا موضوع اختلاف قرأءت اور غامدی صاحب کے افترأت)

غامدی صاحب متن سامنے رکھ کر جب شرح کو اس وقت دیکھا جاتا ہے کہ جب متن کسی اور کا ہوتا ہے اور شرح کرنے والا کوئی دوسرا ہوتا ہے جیسا کہ امتحانات میں طالب علم کو کسی شاعر کے اشعار کی شرح کا کہا جاتا ہے اور جب وہ طالبعلم ان اشعار کی شرح کر لیتا ہے تو پھر استاد اسی طالب علم کی شرح کی تصحیح کرتا ہے تو اسے متن کو سامنے رکھ کر اس طالب علم کی شرح کو دیکھنا پڑتا ہے لیکن جب صاحب متن خود ہی اس کی شرح کرے تو اس طرح کی ضرورت نہیں پڑتی ۔

یہاں پر بھی معاملہ کچھ اسی طرح ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نازل کیا اور اسکی شرح وضاحت خود اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے نبی کے ذریعے بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے **''ثم ان علینا بیانه ''** (القیامہ ۷۵۔آیت ۱۹) پھر ہمارے ہی ذمہ ہے کہ ہم اسکی شرح کی وضاحت کریں

اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے **''وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس مانزل الیهم ''**(النحل ۱۶۔آیت ۴۴)

اور ہم نے اس ذکر کو تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم اسکی شرح وضاحت کردو جوان کی طرف اتارا گیا ہے۔

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ کہہ رہا ہے کہ اس قرآن کی شرح وضاحت ہمارے ذمہ ہے اور دوسری طرف ارشاد فرمارہا ہے اے نبی ﷺ آپ قرآن کریم کی شرح وضاحت کریں ان دونوں آیتوں میں صحیح تطبیق یہی ہوسکتی ہے کہ قرآن کی شرح وضاحت بھی اللہ کی طرف سے ہوئی ہے لیکن اسکا ذریعہ نبی ﷺ ہیں ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ اس بات کو واضح کررہا ہے کہ قرآن کی شرح کی وضاحت ہم کریں گے لیکن اسکو لوگوں کے سامنے آپ ﷺ نے بیان کرنا ہے قرآن کی یہی شرح وضاحت آپ ﷺ کی حدیث کہلاتی ہے لہٰذا یہ بات کہنا کہ متن کو دیکھے بغیر شرح کو سمجھنا ناممکن ہے کسی ایسے متن وشرح کے متعلق درست ہے کہ جس میں متن کسی کا ہو اور شرح کسی دوسرے نے کی ہو لیکن قرآن وحدیث کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کیونکہ قرآن اور اسکی شرح (حدیث) دونوں اللہ ہی کی طرف سے ہے اور ان دونوں کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے لی ہے۔

اس ضمن میں غامدی صاحب نے رجم کے واقعات کعب بن اشرف کے قتل کا واقعہ اور مرتد کے قتل سے متعلق حدیث اور **''امرت ان اقاتل الناس ''** جیسی عظیم حدیث کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔

دراصل ان احادیث میں رجم کی سزا گستاخ رسول کی سزا اور مرتد کی سزا اور جہاد وقتال کے احکامات کا ذکر ہے اور اسی طرح عذاب قبر اور شفاعت کا ذکر ہے۔

اور غامدی صاحب ان تمام چیزوں کے منکر ہیں دراصل غامدی صاحب کی عادت ان لوگوں سے ہٹ کر جو صحیح حدیثوں پر طعن کرتے ہیں وہ لوگ مطلق طور پر صحیح حدیثوں پر اعتراض کر کے اسکا رد کر دیتے ہیں اور غامدی صاحب مطلق طور پر صحیح احادیث کا رد نہیں کرتے بلکہ جو صحیح حدیثیں غامدی صاحب کو ان کے نظریہ کے خلاف نظر آتی ہیں تو اس قسم کے اصول بناتے ہیں : کہ ان احادیث کا جو کہ ان کے خلاف نظریہ ہے اس اصول کے ماتحت رد ہوجائے تاکہ وہ یہ ثابت کرسکیں کہ وہ احادیث کے منکر نہیں ۔ حالانکہ اگر کوّا ہنس کی چال بھی چلے تب بھی وہ کوّا ہی رہتا ہے

۔اگرچہ ہنس کی چال چلتے ہوئے کوّا اپنی چال بھول جاتا ہے کسی نے صحیح کہا ہے کوّا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔

جو احادیث غامدی صاحب نے اس مضمون میں مثال کے طور پر پیش کی ہیں یہ تمام تر احادیث صحیح ہیں اور محکم ہیں اور ان میں سے کوئی حدیث بھی قرآن کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ وہی مدعا ہے جس کو قرآن نے بیان کیا ہے۔

سنت اور حدیث میں فرق

سنت کے لغوی معنی طریقہ یا راستہ کے ہیں (النھایہ فی غریب الحدیث جلد۲ص ۳۶۸)اور جبکہ حدیث کو لغت میں جدت کے معنی میں لیا جاتا ہے اور حدیث کو لغت میں کسی کلام یا کوئی بات بھی کہا جاتا ہے۔(السنۃ قبل التدوین ص ۲۰)

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

الله نزل احسن الحديث (الزمر آیت ۲۳)

اللہ تعالیٰ نے بہترین حدیث نازل کی ہے۔

حدیث کے معنی اصطلاح میں ہر اس قول ،فعل ،تقریر اور صفت کو کہتے ہیں جس کی نسبت حضورﷺ کی طرف کی جاتی ہو۔

(اصطلاح الحدیث کی تعریف وتشریح از ڈاکٹر محمود الطحان) محدثین کے نزدیک سنت کی بھی اصطلاحی تعریف یہی ہے جو حدیث کی بیان ہوئی ہے (ارشاد الفحول للشوکانی مع تحقیق صبحی بن حلاق)

ڈاکٹر صبحی صالح فرماتے ہیں اگر ہم محدثین بالعموم اور متاخرین محدثین بالخصوص کی غالب رائے پر عمل کریں تو ہم حدیث وسنت کے الفاظ کو مترادف ومساوی پائیں گے یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال کئے جاتے ہیں اور ان دونوں کا مفہوم کسی قول فعل تقریر یا صفت کو سرور کائناتﷺ کی جانب منسوب کرنا ہے البتہ اگر حدیث وسنت کے الفاظ کو ان اصول تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ان دونوں کے استعمال میں لغت واصطلاح کے پیش نظر کچھ دقیق سا فرق بھی پایا جاتا ہے (علوم الحدیث ومصطلحہ للصبحی الصالح ۔ص ۱۱۳)

اگر حدیث وسنت کے لفظ کا انفرادی طور پر استعمال کیا جائے تو سنت سے مراد حدیث اور حدیث سے مراد سنت ہوتی ہے۔

ابن اثیرؒ فرماتے ہیں ”**يقال في ادلة الشرع الكتاب والسنة ،اى القرآن والحديث** ،،شرعی دلائل میں کہا جاتا ہے کہ قرآن وسنت تو اس سے مراد ہوتا ہے قرآن وحدیث“(النھایہ فی غریب الحدیث،ص ۳۶۸)

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سنت سے مراد وہ عمل ہے جو صدر اوّل (پچھلے انبیاء سے چلا آرہا ہو ۔اور اگر غامدی صاحب کے مبادی سنت کا کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو انکی سنت سے مراد بھی کچھ اسی طرح ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ سنت کی اسی تعریف کو مان لیا جائے تو بھی حدیث اور سنت میں زیادہ فرق نہیں آتا۔کیونکہ ہمیں کس طرح معلوم ہوگا کہ کہ یہ عمل صدر اوّل سے چلا آرہا ہے؟ تو اس کا معقول جواب یہی ہوسکتا ہے کہ اس کی معرفت ہمیں حدیث ہی کے ذریعے ہوگی اور صدر اوّل کے اسی عمل کو تسلیم کیا جائے گا جس پر نبیﷺ نے عمل کیا ہو یا عمل کرنے کا حکم دیا ہو۔اور یہ بھی ہمیں حدیث سے معلوم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے ”**لكل جعلنا منكم شرعة ومنها جا**“(المائدہ ۔آیت ۴۸)

''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت اور طریقہ مقرر کیا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام بخاریؒ نے ابن عباسؓ کا قول ذکر کیا ہے: **''قال ابن عباس شرعة ومنهاجا ،سبيلا وسنة ۔**
(صحیح بخاری مع فتح کتاب الایمان جلد۱ ص۶۳)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں ''شرعة سے مراد سبیل (راستہ) اور منھاجا'' سے مراد سنت ہے اس قول کو امام بخاری نے تعلیقاً ذکر کیا ہے لیکن امام ابن حجرؒ نے اس روایت کو تغلیق التعلیق میں ذکر کیا ہے اور موصول بنایا ہے حافظ ابن حجرؒ اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں ''ھذا حدیث صحیح'' یہ حدیث صحیح ہے (تغلیق التعلیق جلد۲ ص۲۵)

یہ ان اصحابی رسول کی تفسیر ہے جن کے لئے رسول ﷺ نے خاص دعا کی تھی کہ اللہ ان کی دین کی سمجھ دے اور قرآن کی تاویل (تفسیر) علم عطا فرما۔

لہٰذا یہ بات یہاں پر بھی عیاں ہوتی کہ تمام انبیاء کا دین ایک ہے لیکن ان کے فروع شریعت اور انکی سنت (طریقہ کار) مختلف ہے تو اصل سنت وہی ہے جس پر نبی ﷺ نے عمل کیا ہو چاہے اس پر پچھلے انبیاء کا عمل رہا ہو یا نہ رہا ہو۔ اور نبی ﷺ کے افعال واعمال یا تقریر یا آپ کی کوئی سی بھی صفت کی معرفت حدیث سے ہی ہوتی ہو اگرچہ حدیث اور سنت میں لغوی اعتبار سے فرق ہے لیکن اصطلاح میں یہ ایک ہی ہیں اور ایک دوسرے کے باہم معنی میں استعمال ہوتے ہیں لہٰذا حدیث ہی سنت ہے اور سنت ہی حدیث ہے۔

صحیح احادیث اور عقل

عقل اللہ تعالیٰ کی عطاء کردہ ایک عظیم نعمت ہے اللہ رب العالمین نے ہمیں یہ نعمت اس لیے عطاء فرمائی ہے کہ ہم اپنے معاملات میں اس کی رہنمائی کو نظر انداز نہ کریں۔ اللہ رب العالمین نے قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر انسان کو اپنی عقل کے استعمال کی ہدایت کی ہے یہ بات تو بلکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دین اسلام کو ماننے سمجھنے اور اس کی تمام ہدایات پر جو اوامر ونواھی پر مشتمل ہے بعینہ عمل کرنے کا مکلّف بھی ٹہرایا ہے شریعت کے بہت سارے معاملات ایسے بھی ہیں کہ جن تک عقل انسانی کی رسائی بلکل ناممکن ہے ایسے ہی معاملات پر بلا تامل یقین کر لینے کا نام ہے مسلمان یعنی اپنی مرضی اپنی عقل اور اپنی خواہشات کو دین کے تابع کر دینا۔ جیسے کسی چیز کو دیکھا اسے سونگھا اسے چکھا اسے محسوس کیا اسے کمپیوٹر جیسے دماغ نے پروسس کیا اور نتیجہ نکال دیا۔ اور قرآن میں متعدد جگہوں پر انسان کو اپنی عقل استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی ہے مگر شریعت کے بہت سارے معاملات اس طرح ہیں کہ ہماری عقل ان تک پہنچنے سے بالکل قاصر ہے مثلاً۔ اللہ رب العالمین کی رؤیت۔ کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو کبھی بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا مگر اس کے باوجود ہم اس کی ذات کو تسلیم کرتے ہیں انسانی عقل بڑی محدود ہے اور جہاں انسانی عقل کام کرنا بند کر دیتی ہے وہیں سے روحانیات شروع ہوجاتی ہے انسانی عقل کا اندازہ اس طرح بھی لگایا جا سکتا ہے کہ رات کے وقت جب چاند آسمان پر پورے آب وتاب سے چمک رہا ہوتا ہے اور ایک شخص جو محوسفر ہے دوران سفر جب چاند کی طرف دیکھتا ہے تو اس کی عقل یہی کہتی ہے کہ چاند بھی میرے ساتھ چل رہا ہے۔ جیسا کہ عربی کا مشہور مقولہ ہے **''الھلال معی''** چاند میرے ساتھ ہے۔ تو قارئین کرام یہ بات بدھیات میں سے ہے اور جب انسان چلتا ہے تو چانداس کے ساتھ نہیں چلتا لیکن ایسا لگتا ہے کہ چانداس کے ساتھ چل رہا ہے۔ اسی طرح اگر آپ دیکھیں تو ایک انسان ایک کھلے میدان میں کھڑا ہوتا ہے تو حد نگاہ اسے ایسا معلوم ہوگا کہ دور کہیں سمندر ہے

مگر درحقیقت وہ ایک سراب ہوتا ہے مگر عقل اسے مجبور کر رہی ہوتی ہے کہ وہ اسے سمندر جانے اور اسے تسلیم کرے۔

معترزین:۔ غور فرمائیں اس قدر انسان کو کم عقل دی گئی ہے اور اسی ناقص عقل کی بناہ پر وہ روحانیت کا انکار کرجاتا ہے اور اپنی اس عقل کو ان شرعی امور جن کا تعلق قطعی طور پر عقل کے ساتھ نہیں ہوتا اس میں اپنی ناقص عقل کو میزان بنالیتا ہے اور پھر اسی میزان میں ان شرعی معاملات کا وزن کرتا ہے پھر جو چیز اس میزان میں پوری اترتی ہے اسے تسلیم کرلیتا ہے وگرنہ اسے رد کردیتا ہے اور اس کا یہ اصول اور قاعدہ صرف اور صرف اللہ کے نبی ﷺ کی احادیث کے ساتھ ہی خاص ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ یہی میزان (عقل کا) قرآن کے ساتھ قائم کرے گا تو اسے معلوم ہے کہ امت مسلمہ اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے گی۔ درجہ ذیل میں ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: کہ جب ذوالقرنین سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچا تو تو اس نے دیکھا کہ سورج کیچڑ میں ڈوب رہا تھا (سورۃ الکھف) غور فرمائیں یہ آیت (بظاہر) عقل ونقل اور بدھیات کے خلاف ہے ماڈرن سائنس نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ سورج ایک خطے میں غروب ہوتا ہے تو دوسرے خطے میں طلوع ہوتا ہے (ایشیاء اور یورپ کی مثال لے لیں) اس کے باوجود تمام لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں اس لیے حضرت علیؓ کا ایک قول ہے کہ اگر دین رائے یا عقل کا نام ہوتا تو مسح ہمیشہ پاؤں کے نچلے حصے میں ہوتا بعض لوگ نے حضرت علیؓ کے اس قول پر بھی اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ جرابوں پر مسح ان کی غلاظت دور کرنے کے لیے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی حیثیت محض ایک علامت کی ہے جس سے ہم ایک طرح کی ذہنی پاکیزگی حاصل کرتے ہیں اول بات تو یہ ہے کہ جرابوں پر مسح کی حیثیت محض **تیمّم** کی طرح ایک علامت کی سی نہیں ہے کیونکہ **تیمّم** کا تعلق اضطرابی کیفیت کے ساتھ ہے جبکہ جرابوں پر مسح مطلق طور پر اللہ کے نبی ﷺ کی متواتر احادیث سے ثابت ہے اگر چہ پانی کم ہو یا زیادہ لہٰذا مسح علی الجوربین کو **تیمّم** کے مشابہ قرار دینا مضحکہ خیز بات ہے اس طرح انسان اگر ہوا خارج کردیتا ہے تو شریعت اسے دوبارہ وضو کرنے کا حکم دیتی ہے یہ بات بھی عقل کے خلاف ہے اس لیے ایک انسان جو ابھی وضو کرکے فارغ ہوا ہے صرف خروج ہوا کی بناء پر دوبارہ وضو کرتا ہے حالانکہ خروج ہوا سے اس کی طہارت پر کوئی اثر نہیں پڑا تو اس کا سیدھا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اللہ رب العالمین کا یہی حکم ہے تو یہاں عقل کو وحی الٰہی (قرآن) کے تابع کردیا جاتا ہے۔ اور اگر ایسی ہی کوئی بات جب صحیح حدیث سے ثابت ہو تو یہاں عقل یاد آجاتی ہے اور عقل کو بنیاد بنا کر حدیث کو رد کردیا جاتا ہے جو کہ بلکل غلط ہے کیونکہ صحیح حدیث بھی وحی الٰہی ہے۔

اب ہم اس اصول کا جوب دیں گے جو بالعموم محدثین سے منسوب کرکے بیان کیا جاتا ہے کہ حدیث اگر عقل یا قرآن کے خلاف ہو تو اسے رد کردینا چاہیے مثلاً۔ حافظ ابن قیمؒ اور علامہ خطیب بغدادیؒ اور ابن الجوزیؒ نے یہ قول بیان کیا ہے کہ وہ حدیث جو عقل یا قرآن کے خلاف ہو یا اصول کے متناقض ہو وہ حدیث صحیح نہیں ہے (تدریب الراوی صفحہ ۱۰۰) سب سے پہلے یہ بات ہے کہ اس قول کو معترضین نے بغیر سیاق وسباق نقل کیا ہے (۱) یہ قول ہر حدیث سے متعلق نہیں ہے کہ جو حدیث عقل کے خلاف آئے اسے رد کردیا جائے بلکہ اس سے مراد ائمہ حدیث کے نزدیک یہ ہے کہ موضوع حدیث عقل کے خلاف ہوتی ہے (مثلاً۔ سفینہ نوح نے کعبۃ اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کی) اب یہ ایک موضوع روایت ہے اور عقل کے خلاف ہے محدثین اس حدیث کو موضوع کہا ہے حدیث کو دیکھ کر اس کو موضوع کہنے کی صرف یہ وجہ نہیں کہ یہ عقل کے خلاف ہے بلکہ موضوع حدیث کی علامت یہ ہے کہ وہ عقل اور قرآن کے خلاف ہوتی ہے۔

محدثینؒ کسی حدیث کو موضوع کا حکم اس کی سند کو دیکھ کر لگاتے ہیں۔ جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث ہے اس حدیث کی سند کے اندر عبدالرحمان بن زید بن اسلم راوی ہے جو اپنی کذب اور افتراء کی وجہ سے مشہور ہے (تہذیب التہذیب)

محدثینؒ اس حدیث پر بھی موضوع کا حکم لگاتے ہیں جو صحیح اور صریح احادیث کے خلاف ہو اس میں بھی محدثین حدیث پر حکم متن نہیں بلکہ سند دیکھ کر لگاتے ہیں یہ بھی موضوع حدیث کی علامت ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی صحیح اور صریح حدیث کے خلاف ہوتی ہے ۔اسی طرح موضوع حدیث بدہیات کے خلاف بھی ہوتی ہے جیسا کہ اس کی مثال سفینہ نوح والی روایت میں گزر چکی ہے ۔(بدہیات یہ عام منطقی اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے ''کہ عادت وفطرت اس کو قبول کرنے میں مانع ہو۔'')

مندرجہ بالا عبارات میں یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ محدثین کے اقوال سے مراد یہ نہیں جو حدیث عقل یا قرآن کے خلاف ہو وہ موضوع ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موضوع حدیث عقل کے خلاف ہوتی ہے اوراس کے موضوع ہونے کا حکم راوی حدیث کے وضاع اور کذاب ہونے کی وجہ سے لگایا جاتا ہے اصول حدیث کی کتابوں میں جہاں کہیں اس طرح کی مثالیں بیاں کی گئی ہیں وہاں کسی بھی محدث نے دلیل کے طور پر صحیح سند سے مروی حدیث کو یہ کہہ کر رد کیا ہو کہ یہ حدیث عقل کے خلاف ہے بلکہ یہ ضرور نقل فرمایا ہے کہ موضوع حدیث عقل کے خلاف ہوتی ہے اور دلیل کے طور پر کوئی روایت پیش کر کے اس کی سند پر کلام فرمایا ہے کہ اس کی سند میں فلاں راوی کذاب وغیرہ ہے لہٰذا یہ حدیث موضوع ہے اور موضوع حدیث عقل کے خلاف ہوتی ہے

سوال ۔محدثین کرام نے قرآن وحدیث سے استنباط کر کے حفاظت حدیث کے لئے جو اصول مرتب فرمائے ہیں کیا ان میں ترمیم کی جاسکتی ہے؟ بالعموم یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جس طرح وہ اصول بنا سکتے ہیں اسی طرح ہم بھی اصول مرتب کر سکتے ہیں؟

جواب :۔اس اعتراض کا جواب دینے سے قبل یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اصول حدیث کیا ہیں ،کیوں ہیں،اور کس لئے مرتب کئے گئے ہیں ۔

اصول حدیث:۔

اصول حدیث سے مراد وہ اصطلاحات ہیں جن کے ذریعے اللہ کے نبی ﷺ کے اقوال و افعال کو غیر نبی کے اقوال وافعال کی آمیزش سے محفوظ کیا جاتا ہے ۔یعنی ان اصول کے ذریعے صحیح احادیث کو ضعیف اور سقیم احادیث سے متمیز کیا جاتا ہے احادیث رسول ﷺ کو پہلے ان اصولوں کے ذریعے اسنادی طور پر پرکھا جاتا ہے اس کے بعد متن حدیث کو پرکھا جاتا ہے پھر کہیں جا کر حدیث پر صحت یا ضعیف کا حکم لگتا ہے(تفصیلات کے لئے اصول حدیث کی کتاب ملاحظہ فرمائیں)

اصول حدیث کی ضروریات کیوں محسوس کی گئی؟

یہ بات تو مسلّم ہے کہ احادیث نبوی آنحضرت ﷺ کے دور میں ہی باقاعدہ اسی طرح مدون ہورہی تھی کہ جس طرح قرآن کی کتابت کی جاتی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ آپ کی نگرانی میں مرتب ہورہی تھی جیسا کہ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ '' **اکتبوا لابی شاہ** ''اور ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ مجھ سے لکھ لیا کرو اللہ کی قسم اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا ۔

(تفصیلات کے لئے تاریخ حدیث از ڈاکٹر جیلانی کی کتاب کا مطالعہ کریں)

مگر جب عہد صدیق میں حفاظ قرآن بکثرت جہاد میں شہید ہوئے تو صحابہ کرام کو قرآن کے ضائع ہونے کا خطرہ محسوس ہوا تو حضرت عمر کے مشورے سے قرآن کو کتابی شکل میں باقاعدہ مدون کرلیا گیا بالکل اسی طرح جب عہد فاروقی کے بعد فتنوں نے سر اٹھانا شروع کردیا باوجود اس بات کے کہ صحابہ وتابعین احادیث رسول کو روایت کرنے کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی اس کی حفاظت کر رہے تھے تو محدثین کرام نے حفاظت حدیث کے لئے باقاعدہ اسناد بیان کرنا شروع کردیں)

صحیح مسلم کے مقدمے میں امام مسلم نے حافظ ابن سیرین کا قول نقل فرماتے ہیں کہ:

لم یکن النا س یسئلون عن الاسناد فلما وقعت الفتنة قالوا سمولنا رجالکم فینظر الی اهل السنة فیؤخذ حدیثهم فینظر الی اهل البدع فلایؤخذ حدیثهم ،

اسی طرح عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ:

الاسناد من الدین فلولاالاسناد لقال من شآء ماشاء''

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں:

الاسناد سلاح المؤمن اذا لم یکن معه سلاح فبأی شئ یقاتل ۔(قواعد لتحدیث للقاسمی)

مندرجہ بالا اسلاف کے اقوال سے مترشح ہوتی ہے کہ جب فتنوں نے سراٹھانا شروع کئے تو روافض معتزلہ اور قدریہ جہمیہ جیسے بڑے فرقوں نے احادیث کو وضع کرنا شروع کیا تو محدثینؒ نے حفاظت حدیث کے لئے سد ذوالقرنین کے مانند ایسے مسدد اصول مرتب فرمائے کہ بقول حالی کے۔

''طلسم ورائی ہر متقی کا توڑا''

''نہ ملا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا''

اور جب تک یہ سلسلہ اسناد چلتا رہا احادیث ان اسناد کے ذریعے روایت ہوتی رہی تو اس وقت تک محدثینؒ نے حفاظت حدیث کے لئے اصول بھی مرتب کرتے گئے اور جب احادیث مکمل طور پر مدون ہوگئیں اور فقہی ابواب پر مرتب ومحفوظ ہوگئیں اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ اسناد بھی ختم ہوگیا تو محدثین نے بھی اصول حدیث کو مرتب فرما کر اس پر مہر ثبت فرمادی اور اب قیامت تک آنے والے جتنے بھی طالب حدیث محدث مجتہد اور مفکر ہیں وہ انہیں اصول کے تابع ہیں اور رہیں گے کیونکہ محدثین نے انسانی بساط کے مطابق تمام صلاحیتوں کو بروء کار لاکر حفاظت حدیث کے لئے مکمل جدجہد کی یہاں تک کہ اگر ایک حدیث کے اندر ایک راوی کے لفظ ''و'' کو زیادہ روایت کیا ہے اور دوسرے راوی نے لفظ ''و'' کو چھوڑا ہے تو محدثین نے اس کیلئے بھی مکمل صراحت کردی اسی طرح اگر ایک راوی کا نام اس کا باپ دوسرے راوی کے نام اس کے باپ کا نام ایک ہی ہے یہاں تک کہ نسبت وغیرہ ایک ہی ہے تو بھی محدثین نے اس کی مکمل جانچ پڑتال کر کے بالکل واضح کردیا مثلا ، ابوجعفر محمد بن جریر الطبری مشہور مورخ ومفسر امام ہیں اسی نام ولدیت اور کنیت سے ایک اور طبری صاحب بھی ہیں۔

فرق یہ ہے کہ امام طبری کے دادا کا نام یزید اور دوسرے کے دادا کا نام رستم ہے امام ابن جریر نامور محدث ومفسر ہیں اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص یہ کہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ امام الہدیٰ نہیں تھے وہ بدعتی ہے اور اس قابل ہے کہ اسے قتل کردیا جائے (لسان) اور دوسرا رافضی ومعتزلی ہے، اتفاق کی بات ہے کہ دونوں باہم معاصر ہیں اور دونوں کی وفات بھی ۳۱۰ھ میں ہوئی البتہ امام طبری ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور دوسرا رافضی ۲۲۶ھ میں پیدا ہوا۔

حافظ ذہبیؒ نے (میزان الاعتدال) میں حافظ ابن حجر نے (لسان المیز ان) میں دونوں کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کیا ہے اور دونوں نے مابین فرق نمایا طور پر بیان کیا۔ کحالہ نے بھی معجم المؤلفین جلد ۹، ص ۱۴۶، ۱۴۷) میں دونوں کو علیحدہ طور پر ذکر کیا ہے۔ بلکہ معروف رافضی مورخ عبداللہ الماممقانی نے (تنقیح المقال جلد ۲، ص ۹۰، ۹۱) کے باب محمد میں بھی دونوں کو علیحدہ علیحدہ ذکر کیا ہے۔

قارئین کرام! محدثین نے حفاظت حدیث کے لیے جس قدر باریک بینی سے کام لیا ہے اس کی مثال تاریخ انسانی میں کہیں نہیں ملتی. بقول مولانا آزاد کے قرآن تو قرآن ہے آسمانی صحائف ہماری احادیث کی تاریخ کا مقابلہ نہیں کرسکتے بقول ایک مشہور مستشرق یہاں دن کی پوری روشنی پڑھ رہی ہے یہاں آپ اپنی مرضی سے نہ کچھ داخل کرسکتے ہیں اور نہ کوئی کمی کرسکتے ہیں۔

مگر افسوس ۱۳ سو سال تک عامۃ المسلمین مجتہدین فقہا کی جماعت جن اصولوں پر عمل پیرا تھی اور ان سے ہی استدلال واستنباط کرتی تھی، ان کے متعلق آج کے دور کا ایک شخص اٹھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محدثین نے بڑا ہی کام کیا ہے کہ جس پر جس قدر داد تحسین دی جائے کم ہے مگر کیونکہ وہ انسان تھے لہٰذا انسانیت کے ناطے ان سے بہت سی چیزیں رہ گئی ہیں تو لہٰذا وقت کا تقاضہ ہے کہ محدثین کے مرتب کردہ اصولوں میں کچھ ترمیم ہونی چاہئے تو ایسے شخص کی عقل اور سوچ پر ماتم ہی کیا جاسکتا ہے مضحکہ خیز بات تو یہ ہے کہ جس فن پر اعتراض کر رہا ہے اس فن کا دورہ تدوین تو ختم ہو چکا ہے کیونکہ فن حدیث کا تعلق اس وقت تک تھا جب تک احادیث اسنادی شکل میں روایت کی جاتی تھیں چونکہ اب سلسلہ اسناد ختم ہو چکا ہے احادیث مرتب ہو چکی ہیں لہٰذا اصول حدیث پر بھی اسی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچ گئے ہیں اب کئی سو سال بعد کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ محدثین کے اصولوں میں ترمیم ہونی چاہئے کچھ کمی بیشی ہے تو عقل عام اس کا مزاق اڑانے کے سوا اور کیا کرسکتی ہے اس اعتراض کو اس مثال سے اسطرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک شخص پندرہ سال تک شعبہ engineering کی تعلیم حاصل کرلے اور certificate لینے کے بعد medical کے فن پر اعتراض کرے کہ سرجری کا یہ طریقہ غلط ہے یہ جو ادویات تیار کی جارہی ہیں ان میں ان چیزوں کی کمی ہے تو قارئین کرام ایسے شخص کے متعلق عقل عام کیا فیصلہ دیتی ہے یہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔

الحمدللہ محدثین کے مرتب کردہ اصول بالکل مکمل اور مبین ہیں اب ان میں نہ تو کسی قسم کی کمی کی جاسکتی ہے مزے کی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ محدثین کے اصولوں پر اعتراض کرتے ہیں خود بھی انہی اصولوں کے ذریعے بحث وتمحیص استنباط کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً۔

(غامدی صاحب) کی نظر میں محدثین کے اصول قابل ترمیم ہیں۔ اور موصوف وقتاً فوقتاً اپنے موقف کی تشریح وتوضیح کے لئے اور احادیث کو باعتبار سند کے جانچنے کے لئے انہی اصولوں کے پابند ہیں اور رہیں گے یہاں تک کہ شیعہ حضرات بھی محدثین کی قدر کرتے ہیں اور ان سے استدلال کرتے ہیں۔ عامۃ المسلمین تو انہی اصولوں سے ہی حدیث کی صحت وضعف کی تعلیم وتفہیم حاصل کرتی ہے۔

اب اعتراض یہ ہوتا ہے کہ (غامدی صاحب) کے نزدیک تو تعامل امت حجت ہے جس کی بنا پر وہ قرآن کی ایک قرأت اور نماز کا طریقہ وغیرہ جیسے اہم مسائل کے مأخذ سمجھتے ہیں اصول حدیث پر تو تقریباً تمام امت کا اجماع ہے اس طرح تو غامدی صاحب کا اصول تعامل امت تو اس بے ہودہ موقف (اصول حدیث میں ترمیم) سے کرچی کرچی ہوجاتا ہے۔ وللہ الحمد

محدثین کے اصول پر ایک نظر:۔

بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حدیث کو پرکھنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے اسماء الرجال یعنی راوی کے حالات دیکھ لئے اگر ثقہ ہے تو حدیث صحیح ہوگی ورنہ ضعیف حالانکہ حدیث کو پرکھنے کے لئے سو سے زائد علوم ہیں اور ہر علم پر ایک تحریری کتاب موجود ہے صرف ضعیف حدیث کی (49) اقسام ہیں (معرفۃ علوم الحدیث) علوم حدیث سے نابلد لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بس سند ہی ایک ذریعہ ہے اور اس دھوکہ میں بھی پڑھ جاتے ہیں کہ کوئی بھی شخص کھڑا ہوجاتا ہے اور تین چار ثقہ راویوں کے نام جڑ دیتا ہے اور کچھ اچھے الفاظ پر مبنی کلام کو حدیث بنا کر پیش کردیتا ہے حالانکہ یہ بات سراسر لاعلمی پر مبنی ہے ذیل میں ہم صرف ایک روایت مع نقد سند ومتن بطور تمثیل پیش کرتے ہیں۔

"عبد الله بن ميمون حدثنا جعفر بن محمد الصادق

عن ابیه (محمد بن حنیفه)عن جابر بن عبدالله قال قال رسول الله ﷺ : سارعوا فی طلب العلم"

جرح :۔

اس حدیث کی سند بظاہر بے حد عمدہ ہے امام جعفر صادق ان کے والد محمد بن حنفیہ اعلی درجے کے متفق علیہ امام ہیں مگر ان کے صرف نام درج کر دینے سے روایت صحیح نہیں ہوجاتی بلکہ سند کے تمام راویوں کی مکمل جانچ پڑتال کرنی پڑے گی اب اس کی سند میں ایک راوی ہے عبداللہ بن میمون بالاتفاق محدثین نے اس کو ضعیف کہا ہے ہم اس کو ہی محدثین کے مرتب کردہ چند جرح وتعدیل کے اصول کے ذریعے اس راوی کو پرکھیں گے۔

سب سے پہلے عبداللہ بن میمون کے حالات تلاش کرنے ہونگے اگر حالات نہ ملیں تو روای مجہول ہوجائے گا اور حدیث پایہ اعتبار سے گر کر ضعیف ہوجائے گی۔اور اگر حالات مہیاء ہوگئے تو اس کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال دیکھیں جائیں گے اور اگر جرح یا تعدیل سے متعلق کوئی قول نہ مل سکا تو راوی مستور ہوجائے گا اور روایت ضعیف ہوجائے گی۔اور اگر ائمہ جرح وتعدیل نے اس کے بارے میں کچھ فرمایا ہوگا کہ مثلاً یہ کاذب ہے یا صادق ہے اگر کاذب ہوا تو روایت موضوع ہوگی۔اور اگر بالفرض محدثین نے اس کو صادق کہہ دیا(جو کہ قریب قریب ناممکن ہے) تو اس میں مزید دوسرے عیوب کی تلاش ہوگی کہ کہیں اس کا حافظہ تو خراب نہیں اگر حافظہ ٹھیک نہیں تو روایت ساقط الاعتبار ہوجائے گی۔یا یہ دیکھا جائے گا کہ روایت بیان کرتے وقت فحش غلطیاں تو نہیں کرتا یا روایت بالحدیث کے وقت غفلت سے کام تو نہیں لیتا۔یا اس کو روایت بیان کرنے میں وہم تو نہیں ہوتا مثلاً وہ اسطرح کہے! (کہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا نہیں نہیں بلکہ شاید آپ ﷺ نے یہ فرمایا) وغیرہ۔ یا راوی حدیث عمومی زندگی کے اندر جھوٹ تو نہیں بولتا اگر کہیں جھوٹ بولنا زندگی میں ثابت ہوجائے تو اس کی روایت کا حکم موضوع ہوگا۔اور اگر اس راوی کے اندر کسی قسم کی کوئی بدعت پائی جاتی ہے اور اس کی بیان کردہ روایت اس کی بدعت کی تائید کرتی ہے تو بھی روایت ضعیف ہوگی اور اگر راوی فسق وفجور میں مبتلا ہے تو بھی اس کی بیان کردہ روایت پر کلام کیا جائے گا اور اگر یہ تمام چیزیں اس کے اندر نہ پائی گئیں تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ جس شیخ سے روایت کررہا ہے کہ آیا اس راوی نے شیخ کا زمانہ پایا ہے یا نہیں اور اگر پایا ہے تو اس بات کی تحقیق کی جائے گی کہ شیخ سے سماع ثابت ہے یا نہیں اور اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ راوی جس سے روایت کررہا ہے اس شیخ کی تاریخ وفات کیا ہے اور راوی کی تاریخ ولادت کیا ہے کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ راوی جس شیخ سے روایت کرتا ہے وہ راوی کی پیدائش سے پانچ یا دس سال قبل مر چکا ہوتا ہے اس صورت میں بھی سند میں انقطاع کی وجہ سے روایت ضعیف ہوجاتی ہے مثلا،عبداللہ بن عبدالجبار بن وائل بن حجر اپنے والد وائل بن حجر سے روایت کرتے ہیں **(جامع ترمذی کتاب الحدود باب ماجاء فی المرأة اذااستکرهت علی الزنیٰ)** حالانکہ عبداللہ بن عبدالجبار بن وائل بن حجر کا سماع اپنے باپ سے ثابت نہیں اس لئے کہ وہ اپنے والد صاحب کی وفات کے ایک مہینے بعد پیدا ہوئے۔

اسی طرح یہ بھی دیکھا جائے گا کہ راوی مدلس تو نہیں اگر مدلس ہے تو یہ دیکھا جائے گا صیغہ تحدیث (حدثنا،اخبرنا) کے الفاظ روایت کررہا ہے یا ایسے الفاظ سے جن سے سماع کا وھم ہوتا ہو (عن قال ذکر) وغیرہ جیسے الفاظ سے روایت کررہا ہے اگر تحدیث کی صراحت کررہا ہے تو مزید آگے کے فنون پر پرکھا جائے گا اور اگر (عن قال ذکر) جیسے موہوم سماع الفاظ نقل کررہا ہے تو روایت ضعیف ہوجائے گی۔بالفرض راوی ان تمام فنون سے گزر جاتا ہے تو یہ دیکھا جائے گا کہ آیا اس کے استاد (امام جعفر صادق سے جو الفاظ یہ راوی نقل کررہا ہے آیا امام جعفر صادق کے دیگر تلامذہ ان الفاظوں میں اس راوی کی موافقت کررہے ہیں یا راوی کی مخالفت اگر موافقت کررہے ہیں تو مزید فنون کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اگر مخالفت ہے تو حدیث شاذ ضعیف ہوکر سندی اعتبار سے گر جائے گی اور بالآخر شروع کے فنون میں ہی ضعیف ثابت ہوجائے گی اسی طرح سند

کے دوسرے راویوں کے بارے میں تحقیق کی جائے گی اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے سند مرسل معضل یا معلل وغیرہ تو نہیں معلل اس روایت کو کہتے ہیں جس کی سند بظاہر متصل ہوتی ہے مگر اصلاً اس میں انقطاع ہوتا ہے محدثین نے اس پر بھی بڑی دقیق النظری سے نقد کیا ہے تفصیلات کے لئے ملاحظہ کریں (کتب العلل الدارقطنی، کتاب العلل امام احمد، کتاب العلل امام ترمذی، العلل لابن مدینی وغیرہ)

قارئین کرام یہ تو راوی کو پرکھنے کے کچھ فنون واصول تھے اسی طرح تقریباً ۵۰ کے قریب فنون صرف راوی کو پرکھنے کے ہیں۔

اب آتے ہیں نقد متن کی طرف:۔

سند کی جانچ پرتال کے بعد متن کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایسا تو نہیں صحابہ کا قول موقوف ہو اور راوی نے اسے غلطی سے مرفوع بیان کر دیا ہو یا صحابی نے کوئی بات کہتے کہتے حدیث سنادی اور راوی نے اس تمام کلام کو حدیث سمجھ کر روایت کر لیا اس دقیق فن پر بھی محدثین نے بڑی ہی غموض النظری سے نہ صرف تحقیق فرمائی بلکہ صحیح معنوں میں تحقیق کا حق اداء کر دیا۔مثلاً ایک روایت فقیہ امت مجتہد مطلق ابوہریرہؓ سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا" **اسبغوا الوضوء ویل للاعقاب من النار** " وضو اچھی طرح کرو ان کے لئے آگ ہے جو اپنی ایڑیوں کو سوکھا چھوڑ دیتے ہیں' اب یہ روایت سنداً صحیح ہے مگر متناً اس میں علت موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ (**اسبغوا الوضوا**) کے الفاظ نبی ﷺ کے نہیں بلکہ امام ابوہریرہؓ کے ہیں محدثین نے اس کی بھی مکمل صراحت فرما کر حفاظت حدیث کا حق ادا کر دیا جیسا کہ ایک دوسری روایت میں ہے

اظہر من الشمس الفاظ کے ساتھ روایت منقول ہے" **عن ابی ھریرۃؓ اسبغوا الوضوافان ابا القاسم قال ویل للاعقاب من النار** " (ابوہریرہ فرماتے ہیں وضو اچھی طرح کرو، کیونکہ ابوقاسم ﷺ نے فرمایا ان کے لئے آگ ہے جو اپنی ایڑیوں کو سوکھا چھوڑ دیتے ہیں) اس کے علاوہ نقد متن پر محدثین نے مفصل ابحاث فرمائی ہیں جن کے ذریعے نبی ﷺ کی حدیث کی پہچان ہوجاتی ہے مثلاً الفاظ حدیث رکیک ہونا (یعنی بے ربط اور گھٹیا الفاظ ہونا) راوی حدیث کا خود اعتراف کر لینا کہ اس نے لوگوں کو دین کی طرف راغب کرنے کے لئے حدیث گھڑی ہے جیسے ابوعصمہ نوح بن ابی مریم یا راوی کا رافضی ہونا یا روایت کا اہل بیت کی شان میں ہونا وغیرہ اسی طرح اور بھی کئی فنون ہیں جن پر متن حدیث کو پرکھا جاتا ہے تفصیلات کے لئے (علوم حدیث کی کتب ملاحظہ کریں، مقدمہ ابن صلاح، فتح المغیث، النکت، تدریب الراوی) اس کے بعد کہیں جا کر حدیث صحیح یا حسن درجہ تک پہنچتی ہے۔

قارئین کرام:۔

مندرجہ بالا مختصر مگر جامع بحث کے بعد یقیناً آپ کے شعور میں یہ بات جاگزین ہوگئی ہوگی کہ محدثین احادیث رسول اللہ ﷺ کی جانچ کے لئے کس قدر احتیاط پرمبنی سخت اور مسدد اصول بنائے ہیں اور یہ اصول بالکل مکمل ہیں اس کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ مستشرقین کی گندی اور سطحی سوچ سے متاثر لوگ جو ان مکمل اصول میں ترمیم کی بات کرتے ہیں وہ خود بھی صرف اور صرف ان ہی اصولوں سے استدلال واستنباط کرتے ہیں باہر سے کوئی نیا اصول نہیں لاتے اگر لائیں گے تو ان شاء اللہ امت اسے رد کر دے گی۔

لہٰذا ہم یہ دعوی کرتے ہیں کہ اگر کوئی مسئلہ یا حدیث ہے جو ان اصولوں پر پوری نہیں اترتی تو وہ ہمیں بتائی جائیں ہم انشاء اللہ اس کو محدثین کے اصولوں کے مطابق ثابت کر کے دکھائیں گے۔

اور ہم اپنی بحث کا خاتمہ جمال الدین قاسمیؒ کے اس قول سے کرتے ہیں کہ محدثین کی جماعت اللہ تعالیٰ ان کی تعداد کو بڑھائے ان کے ستونوں کو مضبوط کر دے ان کے لئے اللہ کے نبی ﷺ کے ساتھ ایک خاص نسبت ہے اور مخصوص معرفت ہے اس معاملہ میں دنیا کا کوئی بھی شخص ان کے ساتھ شریک نہیں ہوسکتا۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

محدثین کی صالحین سے روایت

اعتراض:۔

محدثین نے جہاں حفاظت حدیث کے لئے سخت سے سخت مؤقف اپنایا اور انتہائی احتیاط پر مبنی اصول مرتب فرمائے وہیں پر صالحین ومبتدعین اور رافضین وشیعہ رواۃ کے مقابل انتہائی کمزور مؤقف اختیار کیا یہاں تک کہ صحیحین کے اندر مبتدعین اور شیعہ راویوں کی بھر مار ہے جبکہ بعض محدثین نے اس بات کی مکمل صراحت فرمائی ہے کہ رافضی اور بدعتی کی روایت کو قبول نہ کیا جائے ۔تو اس طرح صحیحین کی وہ روایات نا قابل قبول ہیں کہ جن میں روافض مبتدعین رواۃ موجود ہیں۔

جواب:۔

اس میں کسی کو شبہ نہیں کہ محدثین نے حدیث کی حفاظت میں انتہائی مسدد ومبین اصول وضع فرمائے ہیں کہ انسانی تاریخ ایسے بے مثل کارنامے پر انگشت بدنداں ہے کہ کہ ہزار سال قبل انتقال کر جانے والے تقریباً ایک لاکھ نفوس کے حالات زندگی ان کی تاریخ پیدائش ،وتاریخ وفات ،رحلات ،علم وفضل ،علمی وعملی کمزوریاں ،ان کے اردگرد کے سیاسی وسماجی حالات ، یہاں تک کے ان کے جسمانی نقائص مثلاً حافظہ کمزور ہونا یا حواس کھوبیٹھنا نگاہوں کا کمزور ہونا یا مکمل نابینا ہوجانا وغیرہ ۔اوران جیسی کتنی ہی اشیاء ہیں جن کو محدثین عظام نے باقاعدہ تحقیق کر کے کتابوں میں مدوّن ومحفوظ کر دیا۔ بقول حالی کے!

کیا فاش راوی میں جوعیب پایا۔۔۔۔۔۔مناقب کو چھانا مثالب کو تایا

مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا۔۔۔۔۔۔ائمہ میں جوداغ دیکھا بتایا

مولانا حالیؒ کے یہ الفاظ محض مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی محدثین کو خراج تحسین ہے کہ جس میں دریا کو کوزے میں بند کیا گیا ہے۔

آج بالعموم یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ محدثین نے صلحاوزاھدین کی جماعت سے ترغیب اور ترھیب میں روایت کرتے وقت کافی تساھل سے کام لیا ہے اور ان پر کماحقہ تنقید نہیں کی ہے ۔حالانکہ یہ اعتراض ناعلمی اور کم فہمی کا نتیجہ ہے کیونکہ محدثین نے ان صالحین زاھدین وصوفیاء (جنکا روایت حدیث میں ضعیف ہونا ثابت ہے) کی روایت پر بھر پور علمی تنقید فرمائی ہے اور ان کی بیان کردہ عمومی احادیث پر موضوع یاضعیف جدا جیسے سخت احکامات لگا کر ان احادیث کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں ۔

(1) امام یحیی بن سعید القطانؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک لاکھ دینار کے لئے جس آدمی کو صحیح سمجھتا ہوں ایک حدیث کے لئے اسے امین نہیں سمجھتا ہوں (الکفایہ فی علم الروایہ)

(2) امام ربیعہ بن عبدالرحمانؒ فرماتے ہیں ہمارے بہت سے بھائی وہ ہیں جن کی دعاؤں کی برکت کے ہم امیدوار ہیں لیکن اگر وہ کسی معاملہ میں شھادت دیں تو ہم ان کی شھادت کو قبول نہ کریں (ایضاً)

(3) امام نوویؒ فرماتے ہیں "**الواضعون اقسام اعظمھم ضراراً قوم ینسبون الی الذھد وضعوہ حسبة** "(تدریب الراوی)

کہ واضعین حدیث کی مختلف اقسام ہیں مگر ان میں سب سے بڑے نقصان پہنچانے والے وہ لوگ ہیں جن کو زاھد (نیکوکار) سمجھا جاتا ہے یہی ہیں وہ جو آخرت کے ثواب کی نیت سے احادیث وضع کرتے ہیں۔

امام غزالی کا پایہ علم بہت اونچا ہے اور ان کی عظمت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے ان کی کتاب

احیاء علوم الدین ذھد وتصوف کی معرکتہ الآراء تصنیف ہے مگر اس میں بھی بے سند احادیث کی بھر مار ہے مشہور محدث صاحب التصانیف علامہ زین الدین عراقی نے اس کی تحقیق کر ڈالی اور تقریبا ایک ہزار کے قریب بے سند وموضوع احادیث کو چھانٹ کر الگ کر ڈالا۔

علامہ تاج الدین السبکی نے طبقات شافعیہ میں امام غزالی کی بے سند احادیث پر مستقل ایک باب باندھا ہے جو سو سے زائد صفحات پر مبنی ہے

قارئین کرام:۔

مختصر سی صراحت کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محدثین نے ایسی زاھدین وصالحین کی روایت کردہ احادیث کی نہ صرف گرفت کی بلکہ ان پر کذاب متھم بالکذب کا حکم لگا کر ان سے اجتناب کی تائید فرمائی۔

مگر اس کے باوجود یہ کہنا کہ محدثین نے ان سے تساھل برتا غلط فہمی پر مبنی نظریہ ہے۔ ہاں یہ بات کسی حد تک حقیقت پر مبنی ہے عوام الناس نے ان صورت وسیرت اور ظاھری دین داری کو دیکھ کر ان کی روایت کردہ احادیث پر اعتماد اور کسی قسم کے شک وشبہ اور نقد وتبصرہ کو مناسب نہ سمجھا۔ مگر محدثین پر ان کے تقوی ورع کا جادو نہ چل سکا حدیث پیش ہوئی راوی کا نام آیا اور محدثین نے حدیث پر موضوع کا حکم لگا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان زاھدین وصالحین اور صوفیاء کی احادیث کو ان کتابوں میں جگہ ملی جو بالخصوص موضوع ومن گھڑت احادیث کو جمع کرنے کے لئے تصنیف کی گئی ۔مثلاً،

تذکرۃ الموضوعات	العقیلی
کتاب الموضوعات	محمد بن طاھر المقدس
المقاصد السنۃ	عبدالرحمان سخاوی
اللالی المصنوعۃ	جلاالدین السیوطی
موضوعات الکبری	ملاعلی قاری

اور جہاں فضائل پر مبنی احادیث میں نرمی کا تعلق ہے ان کو قبول کرنے کے لئے بھی محدثین نے کچھ شرائط رکھی ہیں جن سے ان کے موقف کا بخوبی اندازہ لیا جا سکتا ہے۔

(۱)ان یکون الضعف غیر شدید ،

(۲)ان لا یعتقد عند العمل به ثبوته لئلا ینسب الی النبی ﷺ بل یعتقد الاحتیاط،

(۳)ان یکون الضعیف مندرجاً تحت اصل عام ،

(۴)ان لا یعارض حدیثا صحیحا،

(٥)ان لا یعتقد سنية ما بدل علیه ،

(٦) ان لا لیشتهر ذلك لئلا یعمل المرء بحدیث ضعیف فیشرع ما لیس بشرع ۔اویراه بعض الجهال فیظن انه سنة صحیحة،

(۱) راوی کا ضعف شدید نہ ہو یعنی کذاب، دجال متھم بالکذب وغیرہ نہ ہو۔

(۲) یہ اعتقاد رکھا جائے کہ یہ فضیلت اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت نہیں تا کہ غلط بات اللہ کے رسول ﷺ کی طرف منسوب نہ ہو سکے۔

(۳) فضائل اعمال کی جو حدیث بیان ہو رہی ہے اس عمل کا اصل حکم حدیث میں موجود ہو۔

(۴) صحیح حدیث کے معارض نہ ہو۔

(۵) اس فضیلت کو سنت نہ سمجھے۔

(۶) وہ فضیلت مشہور نہ تا کہ انسان اس حدیث پر عمل کر کے ایسے عمل کو مشروع کر ڈالے جو کہ اصلاً

مشروع نہیں ہے۔یا جہلاء قسم کے لوگ اس کو سنت صحیحہ سمجھنے لگیں۔

ان شرائط پر غور وفکر کرنے کے بعد اندازہ ہوجاتا ہے کہ محدثین نے اس معاملہ میں بھی (جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تساھل سے کام لیا) کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے۔

لہٰذا اب اس اعتراض کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی ہے۔صالحین کی بیان کردہ روایت میں محدثین نے نرمی کا مظاہرہ کیا۔ وللہ الحمد۔

اس بات سے انکار نہیں کہ وضع حدیث کے فتنے سے سب سے زیادہ فائدہ ان گمراہ بدعتی فرقوں نے اٹھایا جو مسلمین کے درمیان پیدا ہوئے مثلاً، زنادقہ ۔جھمیہ۔روافض وغیرہ اور موضوع احادیث کو اپنے سیاسی ومسلکی نظریات کی تائیدوترویج کے لئے استعمال کیا مگر اس کے باوجود بھی محدثین نے ان ہی بدعتی رواۃ سے احتجاج کیا اور ان کی بیان کردہ احادیث کو صحیح قرار دیا جیسا کہ صحیح بخاری میں بعض رواۃ ہیں جو کہ خارجی اور مرجئی ہیں اور صحیح مسلم میں شیعہ رواۃ کی بھرمار ہے۔

(۱) محدثین نے بدعت کے مرتکب رواۃ میں سے صرف ان سے احتجاج کیا ہے کہ جن کی بدعت درجہ تکفیر تک نہیں پہنچتی۔

(۲) بدعتی راوی اپنی بدعت کا پرچار نہ کرتا ہو۔

(۳) روایت کردہ حدیث اسکی بدعت کی تائید میں نہ ہو۔

(۴) اگر بدعتی راوی اپنے مذھب کی تائید میں جھوٹ کو حلال سمجھتا ہو تو اسکی روایت کو قبول نہ کیا گا۔

اب ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

محدثین نے بدعت کے دو طبقے رکھیں ہیں۔

بدعت کفریہ

(ا) اللہ رب العزت کی صفات کا انکار کرنا جیسا کہ فرقہ جھمیہ کا عقیدہ ہے

(ب) یا قرآن میں تحریف کا عقیدہ رکھنا اور اصحاب رسول کو مرتد خیال کرنا جو کہ روافض کا نظریہ ہے۔

(د) اسلامی شعار کا مذاق اڑانا جیسا کہ زنادقہ کا مسلک ہے وغیرہ۔

بدعت فسق:۔

مثلاً یہ عقیدہ رکھنا کہ ایمان لانے کے بعد کبیرہ گناہ سے ایمان پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔جیسا کہ مرجئہ (۴) یا اشیاء کی تخلیق سے قبل اس کی تقدیر کا انکار کرنا مثلاً قدریہ (۵) یا خوارج (۶) وغیرہ۔

---

(۱) جھمیہ:۔اس کا موجد جھم بن صفوان تھا اس کا اور اسکے معتقدین کا نظریہ تھا کہ اللہ قادر ہے بلا قدرت کے سمیع ہے بلا سماعت کے وغیرہ اور ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ ابراھیم کو خلیل اللہ نہیں بنایا وغیرہ۔

(۲) روافض:۔یہ وہ فرقہ ہے جو اصحاب رسول کی ارتداد کا نظریہ رکھتا ہے اور حضرت علی کو اپنا رب تسلیم کرتے ہیں وغیرہ۔

(۳) زنادقہ:۔موجد دین فروز آبادی قاموس میں فرماتے ہیں کہ زندیق وہ لوگ ہیں جو آخرت اور ربوبیت پر ایمان نہیں رکھتے اپنا کفر چھپاتے ہیں اور ایمان ظاہر کرتے ہیں حلال وحرام کو مشترک سمجھتے ہیں۔

(۴) مرجئہ:۔سے مراد وہ فرقہ ہے جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ **"الایمان لا یزید ولا ینقص"** کہ ایمان گھٹتا بڑھتا نہیں ہے اور ایمان کا عمل سے کوئی تعلق نہیں۔

(۵) قدریہ:۔ حافظ ابن حجر ھدی الساری میں فرماتے ہیں کہ " **القدریه من یزعم ان الشر فعل العبدوحده**"۔
قدریہ وہ ہیں جو یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ انسان کا ہر عمل اسکی اپنی تخلیق ہے۔اس کی نسبت اللہ کی طرف کرنا غلط ہے۔
(۶) خوارج:۔ یہ وہ گروہ ہے جس نے مسئلہ تحکیم میں حضرت علی کے خلاف خروج کیا اور ان کی تکفیر کی (الملل والنحل)

اول الذکر بدعت کے متعلق تو جمہور محدثین کا اتفاق ہے کہ ان سے روایت نہ لی جائے بلکہ ان کے نام آتے ہی حدیث پر موضوع کا حکم لگ جاتا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں (الکفایہ۔تدریب الراوی)

اور رہی بات ثانی الذکر بدعتی فرقوں کی۔تو محدثین نے ان سے روایت کا اہتمام کیا ہے اور اس کے لئے جو شروط لگائی ہیں وہ پیچھے گزر چکی ہیں مثلاً بدعت کفر تک نہ پہنچے۔اگر ایک انسان اللہ تعالی سے اعتقاد میں غلو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان کے برے اعمال خود اسکی تخلیق ہیں اللہ تعالی انسان سے برائی کراتا۔یا یہ نظریہ رکھتا ہے کہ ایمان برے اعمال کرنے سے کم نہیں ہوتا وغیرہ اور وہ شخص صدق عدالت اتقان میں انتہائی قوی ہو تو کیا ہم اس کو کافر کہہ سکتے ہیں ہرگز نہیں بلکہ اس کے نظریہ کو ہم غلط کہہ سکتے ہیں اور اسکو بدعت پر محمول کر سکتے ہیں یہ نہیں کہ ہم اس پر فتوی بازی شروع کر دیں۔

ہاں اگر وہ راوی اپنی بدعت کا پرچار کرتا ہے یا ایسی روایت پیش کرتا ہے جو اسکی بدعت کی موافقت میں تو اس وقت اسکی روایت کو قبول نہیں کیا جائے وہ بھی صرف احتمال کی وجہ سے نہ کہ یقینی بنیاد پر کہ اس نے حدیث گھڑی وغیرہ۔

اب یہاں اعتراض ہوتا ہے کہ صحیح بخاری کا راوی (عمران بن حطان سدوس) یہ خارجی ہے اور اپنی بدعت کا داعی بھی ہے اس کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں۔

(۱) کہ روایات اس کی بدعت سے قبل کی ہیں۔

(۲) اس نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا۔

(۳) امام بخاری نے اس سے اصول کے بجائے متابعات میں احتجاج کیا ہے (ھدی الساری صفحہ ۶۰۵)

خوارج کے متعلق عرض ہے کہ ان کی روایت دوسرے رواۃ حدیث کے مقابل میں زیادہ قابل اعتماد ہے جس کی امام ابن تیمیہ نے دس وجوہات ذکر فرمائی ہیں۔

ان میں سب سے بڑی وجہ یہ کہ خوارج جھوٹ بولنے کو کفر سمجھتے ہیں اور ایسے شخص کو کافر گردانتے ہیں جو جھوٹا ہو تو کیسے ہوسکتا ہے کہ خوارج اللہ کے نبی ﷺ پر جھوٹ باندھے۔

چوتھی شرط یہ تھی کہ بدعتی راوی اپنے مذہب کی تائید میں جھوٹ کو حلال نہ سمجھتا ہو اس شرط کے تحت محدثین نے صرف ان بدعتی رواۃ سے ہی احادیث لی ہیں کہ جن کا صدق واتقان معروف تھا۔

رہی بات زنادقہ جھمیہ روافض وغیرہ تو ان کا احادیث میں جھوٹ بولنا بالکل واضح ہے بلکہ بعض زنادقہ نے خود اعتراف کیا کہ ہم نے چار ہزار سے زائد احادیث گھڑ کر عوام میں پھیلا دیں۔روافض تو حدیث گھڑنے میں مشہور ومعروف ہیں تو محدثین نے ان کی بیان کردہ احادیث پر موضوع کا حکم لگایا ہے نہ کہ صحت حدیث کا اور ان کو کتب موضوعات میں جگہ دی ہے۔

اور یہ اعتراض کہ صحیحین میں شیعہ رواۃ ہیں جو کہ احادیث گھڑتے تھے وغیرہ۔یہ اعتراض بھی انتہائی غلط فہمی پر مبنی ہے۔

سلف صالحین کے نزدیک شعیہ اور رافضی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

شیعان علی سے مراد وہ گروہ ہے جو حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر فضیلت دیا کرتے تھے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے التھذیب جلد ۱ صفحہ ۹۴ میں صراحت کی ہے امام ذھبی فرماتے ہیں سلف صالحین میں غالی شیعہ وہ لوگ جو حضرت عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، وغیرہ صحابہ کرام جنہوں نے حضرت علی کے ساتھ اختلاف کیا تھا کے بارے میں کلام کرتے اور معترض ہوتے تھے (المیز ان جلد ۱ صفحہ ۵)

جبکہ روافض سے مراد وہ فرقہ ہے جو تمام اصحاب رسول کے ارتداد اور علیؓ کی الوھیت کے قائل اور تحریف قرآن کا نظریہ رکھتے ہے۔

اول الذکر گروہ کی روایت کو نہ صرف محدثین نے قبول کیا بلکہ ان پر صحت کا بھی حکم لگایا کیونکہ حضرت علی کو حضرت عثمان پر فضیلت دینے سے نہ تو کوئی کافر ہوجاتا ہے اور نہ اس سے عدالت ضبط واتقان پر کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علی کو فضیلت دینے کی بناء پر ان سے روایت نہ کی جائے اور یہی محدثین نے کیا اس وجہ سے صحیحین کے اندر ایسے ہی شیعہ رواۃ ہیں جن سے شیخین احتجاج کیا ہے جو کہ قطعی حجت حدیث کے لئے مضر نہیں ہیں جبکہ ثانی الذکر فرقے کی روایات کو محدثین نے موضوع کا حکم لگایا ہے اس لئے کہ روافض احادیث گھڑنے میں مشھور ومعروف ہیں لہذا یہ اعتراض کالعدم ہوجاتا ہے کہ صحیحین میں ایسے شیعہ رواۃ ہیں جو ضعیف ہیں اور احادیث گھڑنے میں مصروف ہیں۔

راوی کا فقیہ ہونا

بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ صحیح حدیث کی جو تعریف محدثینؒ سے منقول ہے وہ مکمل نہیں محدثین نے صحیح حدیث کے لیے جو پانچ شرائط ذکر کیے ہیں ان شرائط میں ایک شرط جو کہ انتہائی ضروری ہے مفقود نظر آتی ہے اور وہ ہے راوی کا فقیہ ہونا۔اس لیے کہ راوی حدیث اگر فقیہ نہ ہوتو روایت بالمعنیٰ کرتے وقت احتمال خطاء موجود رہتا ہے کہ وہ مطلق روایت کو مقید اور مقید کو مطلق بیان کرے۔جس سے حدیث کے مفہوم پر بڑا فرق پڑ سکتا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ راوی حدیث کا فقیہ ہونا ضروری ہے تاکہ تحمل حدیث سے اداء حدیث تک جو ایک بڑا خطاء کا احتمال ہے وہ ختم ہوجائے اس بات کی طرف شاہ ولی اللہؒ نے بھی اشارہ کیا ہے۔

تحمل حدیث سے ادائے حدیث تک راوی کا فقیہ ہونے کی شرط سب سے پہلے جن لوگوں نے لگائی ہے وہ احناف ہیں اس کا پس منظر یہ ہے کہ فقہ حنفی کے اکثر وبیشتر مسائل صحیح احادیث کے بالکل خلاف ہیں اس وجہ سے احناف نے پہلے تو توڑ جوڑ کر صریح اور صحیح احادیث کو اپنے مسلک کے موافق ڈھالنے کی کوشش کی اور جب اس سے بھی کام نہیں چلا تو کچھ ایسے اصول مرتب کیے جن اصول سے صحابہ کرامؓ کی عظمت پر چوٹ پڑتی نظر آتی ہے اور محدثینؒ کے قرآن اور حدیث سے استنباط کیے ہوئے اصولوں کی نفی ہوتی ہے جیسے بیع المصر اۃ (یعنی ایک شخص بکری خریدتا ہے اور تین دن اپنے پاس رکھتا ہے اور اس کا دودھ وغیرہ استعمال کرتا ہے اب اگر وہ بکری واپس کرنا چاہے تو اس بارے سرور کائنات ﷺ کا فرمان منقول ہے کہ مشتری بائع کو ایک صاع کھجور دے کیونکہ اس نے بکری کا دودھ وغیرہ استعمال کیا ہے) کا مسئلہ فقہ حنفیہ کے اصولوں کے خلاف ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث قیاس کے خلاف ہے ہونا یہ چاہیے تھا کہ دودھ کے بدلے دودھ دیا جائے مگر حدیث کے اندر کھجور دینے کا ذکر ہے۔اگر ہم اس حدیث کو صحیح تسلیم کر کے قبول کریں گے تو قیاس کا دروازہ بند ہوجائے گا لہذا صریح اور صحیح حدیث کو رد کرنے کے لیے ایک عجیب وغریب اصول گھڑا کہ روایت حدیث میں مرکزی راوی کا فقیہ ہونا ضروری ہے اسی اصول کی رو سے مجتہد مطلق فقیہ امت امام ابو ہریرہؓ کو غیر فقیہ قرار دے کر ان کی روایت کو چھوڑ دیا گیا ہے۔اسی طرح دورے حاضر کے نام نہاد محقق ودانشور مسٹر جاوید احمد غامدی نے اس اصول کی مزید وضاحت یہ کی ہے کہ روایت حدیث میں ہر طبقے کے راوی کے لیے فقیہ ہونا ضروری ہے یہاں پر غور طلب بات یہ ہے کہ مسٹر غامدی نے احناف کے چبا کر تھوکے ہوئے چنوں کو مزید چبانے کی کوشش کی ہے۔

اب ہم اس اصول کی کہ کیا واقعی روایت حدیث میں محدثین کے جو پانچ شرائط ہیں ان میں راوی کی فقاہت ضروری ہے یا نہیں۔

وہ پانچ شروط مندرجہ ذیل ہیں۔" **ما اتصل سندہ بنقل العدل تام الضبط عن مثلہ الیٰ منتھاہ من غیر شذوذ ولا علۃ** "

محدثین کرام نے راوی کے لیے جو پہلی شرط لگائی ہیں وہ ہے۔ اس کا عادل ہونا۔ حافظ ابن حجر عدل کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں

من له ملكة تحمله على ملازمة التقوى والمرؤة والمراد بالتقوى : اجتناب الاعمال السيئة من شرك اوفسق اوبدعة۔

عادل سے مراد وہ شخص ہے جسے وہ قوت راسخہ حاصل ہو جو اسے تقویٰ اور مروءت پر آمادہ کرے۔ اور تقویٰ سے مراد شرک، فسق اور بدعت جیسے برے اعمال سے اجتناب ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے الکنت میں عدالت کی شرط کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

"ان اشتراط العدالة يستدعى صدق الراوى وعدم غفلة وعدم تساهلة عند التحمل والاداء۔"

عدالت کی شرط راوی کی صداقت اور تحمل واداء حدیث کے وقت عدم غفلت اور عدم تساہل کا تقاضا کرتی ہے۔

قارئین کرام۔ محدثین نے صحت حدیث پر عدالت کی شرط لگا کر غیر مسلم اور مشرک کی روایت سے احتراز کیا ہے اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ راوی حدیث چاہے اس کا تعلق کسی بھی طبقے سے ہو اس کو دین اسلام کی مکمل معلومات کے ساتھ ساتھ اس کے بنیادی اصولوں کو بھی جانتا ہوتا کہ وہ اعمال سیئہ اور فسق اور فجور سے اجتناب کر سکے اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ

عدالت راوی متضمن ہے فقاہت راوی کو۔ راوی حدیث فسق وفجور بدعات اور شرک سے اسی وقت اجتناب کر پائے گا جب اسے دین کی مکمل معرفت ہو اور اسی معرفت کا نام فقاہت ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔" **من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین** "

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی فقاہت دیتا ہے۔ اور فقاہت نام ہے تحمل حدیث سے لے کر اداء حدیث تک کا۔ اس تحمل حدیث سے اداء حدیث تک راوی کا تام الضبط ہونا محدثین کی دوسری بنیادی شرط ہے۔

امام الحافظ بن الحجر العسقلانیؒ فرماتے ہیں ضبط الراوی سے مراد یہ ہے کہ۔" **وھو ان یثبت ما سمعہ بحیث یتمکن من استحضارہ متیٰ شاء**"۔

ضبط قلبی سے مراد یہ ہے کہ راوی نے جو کچھ سنا ہے اس قدر راسخ ہو جائے کہ وہ جب چاہے اسے ادا کر دے۔

محدثین نے تام الضبط کی شرط لگا کر مغفل راوی (یعنی روایت میں زیادہ غلطیاں کرنے والا) سے احتراز کیا ہے محدثین کا یہ اصول رسول اکرم ﷺ کے اس فرمان سے لیا گیا ہے۔"

نضر اللہ امرئ سمع مقالتی فحفظھا ووعاھا واداھا کما سمعھا"

(رواہ بخاری ومسلم)

اللہ تعالیٰ تر و تازہ رکھے اس شخص کو جس نے میری بات سنی اس کی حفاظت کی اور بعینہ اس کو اس طرح منتقل کیا جس طرح سنا۔ تو مندرجہ بالا بحث سے یہ بات ثابت اور اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ صحیح حدیث کی سند میں عدالت اور تام الضبط کی جو شرط لگائی گئی ہیں اس میں فقاہت خود بخود شامل ہو جاتی ہے۔

حافظ خطیب البغدادی اپنی شہرہ آفاق تصنیف الکفایہ فی علم الروایہ میں اپنی سند کے ساتھ

عبداللہ ابن المبارک کا ایک قول نقل کرتے ہیں عادل راوی کے متعلق۔ "**من کان فیہ خمس خصال یشھد الجماعۃ ولا یشرب ھذا الشراب ولا تکون فی دینہ خربۃ ولا یکذب ولایکون فی عقلہ شیٔ**"۔جس شخص کے اندر پانچ خصلتیں ہوں وہ شخص عادل ہے(۱) نماز باجماعت کا پابند ہو(۲) نشہ نہ کرتا ہو(۳) دینی خرابی اس کے اندر نہ ہو(۴) جھوٹا نہ ہو(۵) عقل سلیم کا حامل ہو۔قرآن کریم میں اللہ رب العالمین ارشادفرماتا ہے:

وماکان المؤمنون لینفروا کافۃ فلو لا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ۔ (سورۃ التوبہ ۔ ۱۲۲)

مسلمان تمام کے تمام جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نہ نکل پڑیں بلکہ کوئی ایک گروہ مسلمانوں میں سے نکلے دین کی فقاہت حاصل کرے۔

قارئین کرام ۔ یہ بات تو ایک مسلمہ حیثیت رکھتی ہے قرآن صرف اصول بیان کرتا ہے اور اسی قرآنی اصول کی رو سے مسلمانوں کی ایک جماعت محدثین کی شکل میں تفقہ فی الدین کے لیے ہمیشہ رحلات اور سفر میں مشغول رہی اور اللہ کے نبی ﷺ کی احادیث جو کہ قرآن کی اصل تشریح وتوضیح ہے ان کو جمع کرنے اور فقہی ابواب پر مرتب کرنے میں ایک انتہائی اہم کردار اداء کیا۔

دین اسلام نام ہے قرآن وحدیث کا۔تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جن رواۃ کے ذریعے یہ دین ہم تک پہنچا وہ تو فقیہ نہ بن سکیں مگر جنھوں نے ان کے بیان کردہ چند چیزوں کو سیکھ کر فقیہ ہونے کے دعوے دار بن گئے تاریخ ابن خلکان میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ امام شافعیؒ سے امام محمدؒ نے جو کے (امام ابوحنیفہؒ کے تلمیذ رشید ہیں) سوال کیا کہ بتاؤ ہمارے استاد (ابوحنیفہؒ) بڑے عالم تھے یا تمہارے استاد (امام مالکؒ)امام شافعی نے فرمایا میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ قرآن کا علم زیادہ کون رکھتا تھا امام محمدؒ نے جواب دیا یقیناً تمہارے استاد پھر میں نے سوال کیا حدیث کا زیادہ علم کون رکھتا تھا تو امام محمد نے جوب دیا تمہارے استاد پھر مین نے اقوال صحابہؓ کے بارے میں پوچھا اس میں بھی اس طرح اقرار کیا پھر میں نے کہا اب رہ گیا قیاس اور قیاس انہی چیزون پر ہوتا ہے (وفیات الاعیان لابن خلکان تذکرہ امام مالک جلد۴صفحہ ۱۳۶)معزز ین اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اصل فقاہت قرآن اور حدیث کے علم ہی کا نام ہے حافظ ابن حزمؒ نے اپنی کتاب (الاحکام فی اصول الاحکام جلد۴صفحہ۱۱۶) نے فقیہ کے لیے جو چیزیں ضروری قراردی ہیں وہ درج ذیل ہیں

(۱) وہ راوی اللہ کے اوامر ونواہی کا علم رکھتا ہو۔(۲) طلب علم کے لیے سفر کرتا ہو(۳) لسان عرب کو جانتا ہو(۴) عربی گرامر کا علم رکھتا ہو۔(۶) سیرۃ الرسول کا جاننے والا ہو۔(۷) مغازی کے بارے میں معلومات رکھتا ہو۔(۸) رسول اللہ ﷺ کے احکامات کو جانتا ہو۔(۹) تقویٰ وورع کا حامل ہو۔(۱۰) رسول اللہ ﷺ نے کس لیے جنگ لڑی اور تحلیل دم کے بعد تحریم الدم کا حکم کب دیا اس کا بھی علم رکھتا ہو

الحمداللہ یہ تمام معلومات صرف اورصرف قرآن اور حدیث سے اخذ کی جاسکتی ہیں۔تو راوی حدیث ان تمام معلومات کا بیان کرنے والا ہے وہ کس طرح فقیہ نہیں ہوسکتا۔

فقیہ ہونے کی شرط خود بخود ان شرائط میں داخل ہے جو محدثین نے صحیح حدیث کے راوی کے لیے ضروری قرار دیئے ہیں اگر فقاہت نام ہے قرآن وحدیث کے علاوہ دیگر علوم کا جس طرح مروجہ فقہ کی کتاب میں مذکور ہیں جیسے اگر کتا بکری کے ساتھ جفتی کرے تو اس سے پیدا ہونے والی چیز کا نام کیا ہونا چاہیے اور وہ چیز حلال ہے یا حرام تو ہم علی الاعلان یہ بات کہتے ہیں کہ نہ صحابہ فقیہ تھے اور نہ محدثین۔

اور اگر فقاہت نام ہے قرآن اور حدیث کا تو الحمداللہ تمام صحابہ اور محدثین سب کے سب فقیہ

تھے جیسا کہ دلائل سے ثابت کیا جاچکا ہے۔

اور فقہا کا حدیث اور علوم حدیث سے کس طرح تعلق تھا اہل علم اس کو بخوبی جانتے ہیں مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے نصب الرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ فتاویٰ عالم گیری، المدونہ۔ وغیرہ۔

جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہانے فقاہت کے نام پر موضوع من گھڑت روایات کو اسلام کا نام دینے کی کوشش کی ہے دور حاضر کے بعض نام نہاد محققین اور دانشوروں نے اپنے اصولوں وقواعد کو اسلام کا نام دینے کی کوشش کی ہیں جس کے لیے ہمیں یہ تکلیف اٹھانی پڑی۔

یہ اعتراضات کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی اسی طرح کے اعتراضات محدثین پر معتزلہ نے اور تقلیدی جمود میں جکڑے ہوئے چند فقہانے بھی کیے تھے اور اللہ کی توفیق سے سلف الصالحین نے ان کا منہ توڑ جواب دیا تھا۔

وباللہ التوفیق۔

مراجع ومصادر

1)تفسير الطبری -- (محمد بن جرير الطبری ؒ)

2)تفسير ابن كثير -- (عما د الدين ابن كثيرؒ)

3)تفسير الكشاف -- (محمد بن عمر الزمخشری)

4)تفسير القرطبی -- (محمد بن احمد القرطبیؒ)

5)تفسير البغوی -- (ابو محمد حسين بن مسعود البغویؒ)

6)فتح القدير -- (الشوكانی ؒ)

7)صحيح بخاری -- (محمد بن اسماعيل البخاری ؒ)

8)صحيح مسلم -- (مسلم بن حجاج القشيریؒ)

9)سنن ابی داؤد -- (ابوداؤدسليمان بن الاشعثؒ)

10)مؤطا امام مالك -- (مالك ابن انس ؒ)

11)مسند احمد -- (احمد بن حنبلؒ)

12)سنن الكبری(البيهقی)-- (احمد بن حسين البيهقیؒ)

13)سنن سعيد ابن منصور -- (سعيد ابن منصورؒ)

14)فتح الباری -- (حافظ ابن حجر العسقلانیؒ)

15)تغليق التعليق -- (ايضاً)

16)التمهيد شرح للمؤطا -- (ابن عبدالبرؒ)

17)الاتقان فی علوم القرآن -- (جلال الدين سيوطیؒ)

18)تدريب الراوی -- (ايضاً)

19)المزهر فی علوم اللغة -- (ايضاً)

20) البرھان فی علوم القرآن۔۔ (الزرکشی ؒ)

21)محاسن الاصطلاح ۔۔ (سراج الدین بالقینی ؒ)

22)الکفایہ فی علم الروایہ۔۔ (احمد بن علی الخطیب بغدای ؒ)

23)معرفۃ علوم الحدیث ۔۔ (حاکم نیسابوری ؒ)

24)التقییدوالایضاح۔۔ (زین الدین حافظ العراقی ؒ)

25)علوم الحدیث ۔۔ (ڈاکٹر خالد غزنوی)

26)اصطلاحات حدیث کی تعریف وتشریح ۔۔ (ڈاکٹر محمود الطحان)

27)علوم الحدیث ومصطلحہ۔۔ (ڈاکٹر صبحی الصالح)

28)ارشاد الفحول مع تحقیق صبحی بن حلاق۔۔ (الشوکانی ؒ حققہ صبحی بن حلاق)

29)قواعد التحدیث ۔۔ (جمال الدین قاسمی)

30)الواضح فی اصول الفقہ۔۔

31)السنہ قبل التدوین ۔۔

32)سیر اعلام النبلاء۔۔ (امام ذھبی ؒ)

33)تذکرۃ الحفاظ ۔۔ (ایضاً)

34)المنار المنیف ۔۔ (حافظ ابن قیم ؒ)

35)لسان العرب ۔۔ (ابن منظور افریقی ؒ)

36)النھایہ فی غریب الحدیث ۔۔ (مجدالدین ابن الاثیر)

37)اتفاق المبانی وافتراق المعانی۔۔ (ابو ربیع سلیمان بن بنین)

38)المعجم المفصل فی غریب الحدی۔۔(ڈاکٹر محمد التونجی)

39)بائبل